36

8 اکتوبر 2003ء — 11 شعبان 1424ھ

ہفت روزہ

ندائے خلافت

لاہور

- کوئی تو ہو جو جنرل مشرف کو جگائے (رعنا خان)
- بیرونِ پاکستان میں پاکستانی صیہونی (محمد عدنان ہارون)
- تاریخ تحریکات احیائے اسلام (قسط وار سلسلہ نمبر 37)

www.tanzeem.org

بیت المال سے وظیفہ

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے یہاں کپڑے کی تجارت ہوتی تھی اور اُسی سے گزر اوقات تھا۔ جب خلیفہ بنائے گئے تو حسبِ معمول صبح کو چند چادریں ہاتھ پر ڈال کر بازار میں فروخت کے لئے تشریف لے چلے۔ راستے میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ ملے۔ پوچھا' کہاں چلے۔ فرمایا' بازار جا رہا ہوں۔ حضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ اگر تم تجارت میں مشغول ہو گئے تو خلافت کے کام کا کیا ہوگا؟ فرمایا' پھر اہل وعیال کو کہاں سے کھلاؤں؟ عرض کیا کہ ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ' جن کو حضور ﷺ نے امین ہونے کا لقب دیا ہے' اُن کے پاس چلیں وہ آپؓ کے لئے بیت المال سے کچھ مقرر کر دیں گے۔ دونوں حضرات ابوعبیدہؓ کے پاس تشریف لے گئے۔ اُنہوں نے ایک مہاجر کو جو اوسطاً ملتا تھا' نہ کم نہ زیادہ' وہ مقرر فرما دیا۔ ایک مرتبہ بیوی نے درخواست کی کہ کوئی میٹھی چیز کھانے کو دل چاہتا ہے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے فرمایا کہ میرے پاس تو دام نہیں کہ خریدوں۔ اہلیہ نے عرض کیا کہ ہم اپنے روز کے کھانے میں سے تھوڑا تھوڑا بچا لیا کریں۔ کچھ دنوں میں اتنی مقدار ہو جائے گی۔ آپؓ نے اجازت فرما دی۔ اہلیہ نے کئی روز میں کچھ تھوڑے سے پیسے جمع کئے۔ آپؓ نے فرمایا کہ تجربے سے یہ معلوم ہوا کہ اتنی مقدار ہمیں بیت المال سے زیادہ ملتی ہے۔ اس لئے اہلیہ نے جو جمع کیا تھا' وہ بھی بیت المال میں جمع فرما دیا' اور آئندہ کے لئے اتنی مقدار' جتنا انہوں نے روزانہ جمع کیا تھا' اپنی تنخواہ میں سے کم کر دیا۔

اتنے بڑے خلیفہ اور بادشاہ پہلے سے اپنی تجارت بھی کرتے تھے اور ضروریات کو کافی بھی تھی' جیسا کہ اُس اعلان سے معلوم ہوتا ہے جو ''صحیح بخاری'' میں حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ جب ابوبکرؓ خلیفہ بنائے گئے تو آپؓ نے فرمایا کہ میری قوم کو یہ بات معلوم ہے کہ میرا پیشہ تجارت میرے اہل وعیال کو ناکافی نہیں تھا' لیکن اب خلافت کی وجہ سے مسلمانوں کے کاروبار میں مشغولی ہے۔ اس لئے بیت المال سے میرے اہل و عیال کا کھانا مقرر ہوگا۔ اس کے باوجود جب حضرت ابوبکر صدیقؓ کا وصال ہونے لگا تو حضرت عائشہؓ کو وصیت فرمائی کہ میری ضرورتوں میں جو چیزیں بیت المال کی ہیں' وہ میرے بعد آنے والے خلیفہ کے حوالے کر دی جائیں۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ آپؓ کے پاس کوئی دینار یا درہم نہیں تھا۔ ایک اونٹنی دودھ کی' ایک پیالہ' ایک خادم تھا۔ بعض روایات میں ایک اوڑھنا' ایک بچھونا بھی آیا ہے۔ یہ اشیاء جب حضرت عمرؓ کے پاس نیابت میں پہنچیں تو آپؓ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ابوبکرؓ پر رحم فرمائیں کہ اپنے سے بعد والے کو مشقت میں ڈال گئے۔

لمحۂ فکریہ

شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا

ڈاکٹر اسرار احمد

سورۃ البقرۃ (آیات 253 تا 254)

بسم اللہ الرحمٰن الرَّحیم

﴿ تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ؕ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِيْنَ مِنْ بَعْدِهِمْ مِّنْ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَلٰكِنِ اخْتَلَفُوْا فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ وَمِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا ۟ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ۝ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ ؕ وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ ﴾

"یہ سب رسول، ہم نے فضیلت دی ہے (ان میں سے) بعض کو بعض پر ان میں سے کسی سے کلام فرمایا اللہ نے اور بلند کئے ان میں سے بعض کے درجے اور دیں ہم نے عیسیٰ فرزند مریم کو کھلی نشانیاں اور مدد فرمائی ہم نے ان کی پاکیزہ روح سے اور اگر چاہتا اللہ تعالیٰ تو نہ لڑتے (جھگڑتے) وہ لوگ جو ان (رسولوں) کے پیچھے آئے بعد اس کے کہ آ گئیں ان کے پاس کھلی نشانیاں لیکن انہوں نے اختلاف کیا ان میں سے کوئی ایمان پر (ثابت) رہا اور ان میں سے کوئی کافر ہو گیا اور اگر چاہتا اللہ تعالیٰ تو نہ لڑتے (جھگڑتے) لیکن اللہ تعالیٰ کرتا ہے جو چاہتا ہے۔ اے ایمان والو! خرچ کرلو اس (مال) سے جو ہم نے دیا ہے تم کو اس سے پہلے کہ آ جائے وہ دن جس میں نہ تو خرید و فروخت ہوگی اور نہ (کفار کے لئے) دوستی ہوگی اور نہ (ان کے لئے) شفاعت اور جو کافر ہیں وہی ظالم ہیں۔"

یہ رسول ہیں، ہم نے ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے۔ یہ ایک اہم قانون بیان ہو رہا ہے کہ تفریق بین الرسل اور تفضیل بین الرسل بالکل الگ الگ چیزیں ہیں۔ تفریق بین الرسل کی نفی ہے جبکہ تفضیل حق ہے۔ رسولوں میں کوئی افضل ہے، کوئی مفضول۔ کسی کو کسی اعتبار سے فضیلت ہے تو کسی کو کسی دوسرے اعتبار سے فضیلت۔ جزوی فضیلتیں مختلف لوگوں کی ہو سکتی ہیں البتہ کلی فضیلت تمام انبیاء و رسل پر حضور ﷺ کو حاصل ہے۔

ان رسولوں میں وہ بھی تھے جن سے اللہ نے کلام فرمایا یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بعضوں کے درجات کسی اور اعتبار سے بڑھا دیئے اور ہم نے مریم کے بیٹے عیسیٰ علیہ السلام کو بڑے کھلے معجزات عطا کئے اور حضرت جبرائیل کے ساتھ ان کی مدد فرمائی۔

جب ان کے پاس واضح تعلیمات آ گئی تھیں تو اگر اللہ چاہتا تو یہ آپس میں نہ لڑتے جھگڑتے، نہ یہودیوں کی آپس میں جنگیں ہوتیں اور نہ یہود و نصاریٰ کے درمیان معرکے ہوتے۔ نہ ہی نصرانیوں کے فرقے ایک دوسرے سے دست و گریبان ہوتے۔ مگر انہوں نے اختلاف کیا۔ ان میں ایسے بھی ہیں جو ایمان لے آئیں گے اور ایسے بھی ہیں جو کفر پر اڑ گئے ہیں اور اگر اللہ چاہتا تو تکوینی طور پر یعنی جبراً وہ ایسا کرتا کہ وہ اختلاف نہ کرتے اور نہ ہی لڑتے اور لیکن اللہ تو جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ اللہ نے دنیا کو اس حکمت پر بنایا ہے کہ یہاں کی زندگی آزمائش ہے اور آزمائش کے لئے آزادی دی ہے کہ جو شخص غلط راستے پر جانا چاہے جائے اور جو شخص صحیح راستہ اپنانا چاہے اپنائے۔

تقریباً دو رکوع طالوت اور جالوت کے ذکر پر مشتمل تھے اور یہ گویا جنگ بدر کے لئے ذہنی اور نفسیاتی تیاری کا مرحلہ تھا۔ یہ بات لاریب ہے کہ جہاں سرفروشی کی ضرورت ہوگی وہاں انفاق مال کی بھی ضرورت ہوگی۔ اسی لئے یہاں پھر انفاق مال کی طرف توجہ دلائی جا رہی ہے۔

اے اہل ایمان خرچ کر دو ان چیزوں میں سے جو اللہ نے تمہیں دی ہیں اس سے پہلے پہلے کہ وہ دن آ دھمکے جس دن نہ کوئی خرید و فروخت ہوگی، نہ کوئی دوستی کام آئے گی اور نہ کوئی شفاعت فائدہ دے گی اور وہ دن یوم حساب ہے اور کافر ہی تو ظالم ہیں۔ یہاں کافر سے اصطلاحی کافر مراد نہیں بلکہ معنوی کافر مراد ہیں جو انفاق کے حکم کی تعمیل نہیں کرتے۔ وہ دیکھتے ہیں کہ دین مغلوب ہے اور اسے غالب کرنے کی جدوجہد ہو رہی ہے۔ اس جدوجہد میں مالی ضروریات اہم ترین تقاضوں میں سے ہیں اور جن لوگوں کو اللہ نے مالی وسعت دے رکھی ہے اور وہ اس موقعہ پر خرچ کر سکتے ہیں مگر نہیں کرتے تو وہ ہی اصل کافر ہیں یعنی انفاق فی سبیل اللہ سے فرار کی راہ اختیار کرنے والے۔ یہاں اس دن کے حساب کتاب کی کیفیت بتا دی گئی کہ وہاں اس وقت نہ لے دے کے چھوٹ جانے کا امکان ہوگا۔ نہ دوستی کام آئے گی اور نہ ہی شفاعت۔ یہاں شفاعت کی نفی آ رہی ہے کیونکہ ساری شفاعت تو اللہ کے اختیار میں ہے۔ وہ جس کو شفاعت کا اختیار دے گا وہی شفاعت کر سکے گا اور جس کے حق میں شفاعت کی اجازت دے گا، اسی کے حق میں شفاعت کی جا سکے گی۔

فرمانِ نبویؐ

چوہدری رحمت اللہ بتر

پڑوسیوں کی گواہی

((عَنْ أَبِی هریرَةَ رضی اللہ عنہ اَنَّ جَاءَ رَجُلٌ اِلَی النَّبِیِّ ﷺ وَقَالَ یَا نَبِیَّ اللّٰهِ دُلَّنِی عَلٰی عَمَلٍ اِذَا عَمِلْتُهُ دَخَلْتُ الْجَنَّةَ ' فَقَالَ کُنْ مُحْسِنًا ' قَالَ وَ کَیْفَ اَعْلَمُ اِنِّی مُحْسِنٌ؟ فَقَالَ تَسْأَلُ جِیْرَانَکَ فَاِنْ قَالُوْ اِنَّکَ مُحْسِنٌ فَأَنْتَ مُحْسِنٌ 'وَاِنْ قَالُوْا اِنَّکَ مُسِیْئٌ فَاَنْتَ مُسِیْئٌ. وَعَنْ عبدِاللّٰهِ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِذَا سَمِعْتَ جِیْرَانَکَ یَقُوْلُوْنَ اَحْسَنْتَ ' فَقَدْ أَحْسَنْتَ ' وَاِذَا سَمِعْتَهُمْ یَقُوْلُوْنَ قَدْ أَسَأْتَ فَقَدْ أَسَأْتَ)) (رواہ النسائی)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی مجھے ایسے عمل بتایئے کہ جب میں وہ اختیار کرلوں تو جنت میں داخل ہو جاؤں۔ اس پر آپؐ نے فرمایا تو محسن بن جا۔ میں نے عرض کی میں کیسے معلوم کروں کہ میں محسن ہوں؟ آپؐ نے فرمایا "اپنے پڑوسیوں سے پوچھ لے اگر وہ تمہیں محسن کہیں تو تو محسن ہے اور اگر وہ تجھے برا کہیں تو تو برا ہے"۔ اور حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جب تو سنے کہ تیرے پڑوسی تیرے بارے میں کہیں کہ تو نیک ہے تو تو نیک ہے اور اگر وہ کہیں کہ تو برا ہے تو برا ہے۔"

انسان کا ہر وقت کا تعلق پڑوس سے ہی ہوتا ہے اور وہ ایک دوسرے سے اچھی طرح واقف ہوتے ہیں۔ اسی لئے ان کی گواہی کو رسول اللہ ﷺ نے اتنی اہمیت دی ہے۔

نمبر 03/10/2
۳۶۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور

اداریہ

مہاتیر محمد کا ''پہلا خطاب''

25 ستمبر کو ملائیشیا کے عظیم قائد اور وزیر اعظم مہاتیر محمد نے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی سے اپنے آخری خطاب میں امریکا اور یورپ کی چیرہ دستیوں کے خلاف جس حریت پسندانہ انداز میں تنقید کرتے ہوئے آوازۂ حق بلند کیا ہے' وہ دنیا بھر کی تمام مظلوم اقوام' اور بالخصوص اسلامیانِ عالم کے جذبات کی ''صحیح'' ترجمان ہے۔ اُن سے ایک روز پہلے پاکستان کے صدر جنرل پرویز مشرف نے بھی خطاب کیا تھا' لیکن اُنہوں نے ''صحیح'' ترجمانی کا حق ادا نہیں کیا تھا' کیونکہ انہوں نے فلسطین و کشمیر کی تحریک آزادی کی حمایت کے ساتھ ساتھ فلسطینیوں اور کشمیریوں پر ظلم کرنے والی مغربی طاقتوں کی دہشت گردی کی بھی حمایت میں اعلان کیا تھا۔

مہاتیر محمد ملائیشیا کی وزارتِ عظمیٰ پر مسلسل 22 سال تک متمکن رہنے کے بعد ماہ رواں (اکتوبر) میں اپنے اس عہدۂ جلیلہ سے سبکدوش ہو رہے ہیں۔ اپنے عہد میں انہوں نے ملائیشیا کی بگڑی ہوئی تقدیر کو سنوارتے ہوئے اُسے اقتصادی لحاظ سے مشرق بعید کا ایک ایسا مستحکم ملک بنا دیا کہ وہ آزادی اور خود مختاری کے ساتھ ہر موقع اور ہر تقریب میں مغرب کی نام نہاد ترقی یافتہ قوموں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر برابری سے گفتگو کر سکتا ہے۔ لہٰذا جنرل اسمبلی سے ڈاکٹر مہاتیر ہی مطالبہ کر سکتے تھے کہ اقوام متحدہ کی سیکورٹی کونسل سے ''ویٹو'' کا حق سلب کیا جائے' کیونکہ ویٹو کا حق غیر جمہوری اور آمرانہ ہونے کی وجہ سے اپنی مرضی سے اقوام عالم کو ریوڑ کی طرح ہانک رہا ہے۔ انہوں نے نام لے کر امریکا اور یورپ پر الزام لگایا کہ وہ اُن غریب ممالک کی گردن میں سامراجیت کا طوق ڈال رہے ہیں' جنہوں نے دوسری جنگ آزادی کے بعد ان مغربیوں سے آزادی حاصل کی تھی۔ وہی لوٹ کھسوٹ والے پرانے ہتھکنڈے دوبارہ آزمائے جا رہے ہیں' وہی اپنی تہذیب کے جراثیم کو زور زبردستی سے مشرقی تہذیب کے اندر سرایت کرنے کی کوششیں ہو رہی ہیں۔ فی الحقیقت یورپی امپریلزم کا احیاء ہو چکا ہے۔ پھر سے غلام بنایا جا چکا ہے اور ہمارے اقتصادی وسائل پر قبضہ کیا جا چکا ہے۔ غریب ملکوں میں کٹھ پتلی حکومتیں قائم کی جا رہی ہیں جو کٹھ پتلیوں کی طرح مغربی سامراجی طاقتوں کے اشاروں پر رقص کر رہی ہیں۔ بین الاقوامی مالیاتی فنڈ' عالمی بنک' عالمی تجارتی تنظیمیں قائم کر کے غریبوں کو زیادہ غریب اور امیروں کو زیادہ امیر بنانے کی عالمی سازشیں ہو رہی ہیں۔

اپنے اِس آخری خطاب سے چند روز پہلے مہاتیر محمد نے کوالالمپور میں منعقدہ نوجوان مسلمان لیڈروں کی بین الاقوامی کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا: ''مسلم ممالک میں پیدا ہونے والی فرسٹریشن سے ہی خود کش دھماکوں کا رجحان پیدا ہوتا ہے' جن سے اسلام کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ خود کش حملوں سے اسلام کی کوئی خدمت ہوتی ہے نہ اس کی فتح ہوتی ہے۔ اسلامیانِ عالم کو چاہئے کہ وہ جدید ہتھیار' ٹینک' لڑاکا طیارے اور راکٹ بنائیں۔ اس وقت مسلم ممالک اپنے دشمنوں پر بھروسہ کئے ہوئے ہیں جو انہیں کمتر درجے کے ہتھیار فراہم کرتے ہیں۔ مسلم ممالک آخر خود اپنے ہتھیار ڈیزائن کر کے اُنہیں ٹیسٹ کرنے کے لئے کیوں نہیں سوچتے۔ مسلمانانِ عالم کو چاہئے کہ دشمنوں کے دل میں خوف پیدا کرنے کے لئے خود کو مسلح کریں۔''

دنیائے اسلام کے میڈیا' صحافیوں اور دانشوروں نے مہاتیر محمد کے اِن دونوں خطابات کو اُسی طرح سراہا' جس طرح اکتوبر 2002ء میں اُن کی اس تجویز کو پسند کیا گیا تھا کہ امریکا اور یورپ کے نئے عالمی سامراج کے خلاف (جو درحقیقت عالم اسلام کا محاصرہ کرنے کے درپے ہے) تیل کا ہتھیار استعمال کیا جائے' لیکن یہ تجویز بعض عرب ملکوں کی باہمی چپقلش کی وجہ سے رُوبہ عمل نہ آ سکی تھی۔

ڈاکٹر مہاتیر محمد اپنے ان پُر جوش' مگر دانش مندانہ اور حقیقت پسندانہ خطابات کی وجہ سے ملائیشیا سے بڑھ کر عالم اسلام کے اُبھرتے ہوئے قائد نظر آتے ہیں۔ عنقریب وہ کوالالمپور میں اپنی صدارت میں عالمی اسلامی کانفرنس کی تنظیم (او آئی سی) کا بھی سربراہی اجلاس منعقد کرنے والے ہیں اور او آئی سی کی تنظیم نو بھی کرنے والے ہیں۔ حکومتی ذمہ داریوں سے آزاد ہونے کے بعد' تمام مسلمان سربراہوں سے خطاب ہی صحیح معنوں میں اُن کا پہلا ''آزاد خطاب'' ہوگا' جس کا صدیوں سے انتظار ہے کہ جو اُمت مسلمہ کو کوالالمپور سے بغداد اور ڈھاکا سے مراکش تک' خواب غفلت سے بیدار کر کے اللہ کی رسی میں مضبوطی سے باندھ دے اور جو:

یا رب دلِ مسلم کو وہ زندہ تمنا دے
روح کو تڑپا دے اور قلب کو گرما دے

(ادارہ تحریر)

تا خلافت کی بنا' دنیا میں ہو پھر استوار
لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب و جگر

قیام خلافت کا نقیب

ندائے خلافت

شمارہ	2 تا 8 اکتوبر 2003ء	جلد
36	۵ تا ۱۱ شعبان ۱۴۲۴ھ	12

بانی: اقتدار احمد مرحوم
مدیر: حافظ عاکف سعید
مدیر (اشاعتِ خصوصی): سید قاسم محمود
نائب مدیر: فرقان دانش خان

مجلس ادارت

ڈاکٹر عبدالخالق۔ مرزا ایوب بیگ
سردار اعوان۔ محمد یونس جنجوعہ
نگران طباعت: شیخ رحیم الدین

پبلشر: محمد سعید اسعد' طابع: رشید احمد چوہدری
مطبع: مکتبہ جدید پریس' ریلوے روڈ' لاہور
مقام اشاعت: 36۔ کے' ماڈل ٹاؤن' لاہور

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی:
67۔ گڑھی شاہو' علامہ اقبال روڈ لاہور
فون: 6316638-6366638 فیکس: 6305110
E-Mail:markaz@tanzeem.org

قیمت فی شمارہ: 5 روپے
سالانہ زرِ تعاون
اندرونِ ملک......250 روپے
بیرون پاکستان
یورپ' ایشیا' افریقہ وغیرہ (1500 روپے)
امریکہ' کینیڈا' آسٹریلیا وغیرہ (2200 روپے)

ایڈیٹر کی ڈاک — قارئین کا اپنا صفحہ

جولائی 2003ء کے آغاز میں ناظم اعلیٰ تنظیم اسلامی پاکستان' محترم اظہر بختیار خلجی صاحب کی جانب سے رضا کارانہ بنیاد پر رفقائے تنظیم سے تفریغ اوقات کے لئے ندا کی گئی تھی۔ لبیک کہنے والے رفقاء میں ہمارے رفیق دیرینہ معزز و مکرم جناب قاضی عبدالقادر بھی شامل ہیں۔ ہماری فرمائش پر قاضی صاحب نے' جو کہ کراچی میں مقیم ہیں' اپنا سوانحی خاکہ ارسال کیا ہے۔ یہاں دوسرے رفقاء کے مطالعے بلکہ حوصلہ افزائی کے لئے پیش خدمت ہے:

✱ میں اس اعلان کی روشنی میں رضا کارانہ طور پر اپنے آپ کو پیش کرتا ہوں۔ میں اپنی عمر کے آخری حصہ کو پورے طور پر بھرپور ہمہ وقتی جدوجہد میں لگانے کا عزم رکھتا ہوں۔

میرے کوائف درج ذیل ہیں:

نام: (قاضی) عبدالقادر ولد قاضی حافظ عبدالغفور مرحوم۔

عمر: **69** سال کا ''نوجوان''۔ تاریخ پیدائش: **2** فروری (سرکاری: یکم جولائی) **1934**ء۔

تعلیمی قابلیت: ایم اے۔ بی کام (ریٹائرڈ سینئر اکاؤنٹنٹ' پاک عرب ریفائنری (پارکو))

سابقہ وطن: قصبہ ڈبائی (محلہ قاضی خیل) ضلع بلند شہر' یوپی' انڈیا۔ **1947**ء میں انڈیا سے پاکستان ہجرت کی اور جب سے کراچی ہی میں ہوں۔

تحریک سے تعلق: دورانِ طالب علمی **1950**ء تا **1955**ء اسلامی جمعیت طلبہ کا رکن رہا۔ بعد ازاں جماعت اسلامی کا رکن۔

تنظیم اسلامی سے تعلق: تاسیسی رفیق ..... تنظیم کی تاسیس سے اب تک ایک ادنیٰ کارکن کی حیثیت سے کام کرتا رہا ہوں ..... تاسیس سے اب تک ایک ماہ کی بھی اعانت ناغہ نہیں کی۔ (الحمدللہ)

..... مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے حلقۂ محسنین کا ایک ادنیٰ خادم ہوں۔

..... انجمن خدام القرآن سندھ سے بحیثیت عام رکن وابستہ ہوں۔

جب سے تنظیم میں **Gradation** ہوئی ہے میری حیثیت اب تک ''مبتدی'' کی ہے۔ تنظیم کو اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ اس کے تقریباً پورے لٹریچر کا مطالعہ کیا ہے۔ ''ملتزم'' کے لئے ''نصاب'' کا بھی مطالعہ کر لیا تھا مگر بوجوہ تربیتی اجتماع میں شرکت نہ کر سکا۔ الحمدللہ میں ابھی تک جسمانی (سماعت کا عارضہ ہے) اور ذہنی طور پر فٹ ہوں۔ گھٹنے کے درد کا بھی عارضہ ہے جس کی وجہ سے نیچے نہیں بیٹھ سکتا۔ کرسی پر بیٹھ کر نماز پڑھتا ہوں۔ ''ملتزم'' کا درجہ حاصل کرنے کے لئے ایک ہفتہ تک گھٹنوں بیٹھنا میرے لئے مشکل ہے۔ ویسے بھی شروع ہی سے میری رائے یہ رہی ہے کہ تاسیسی رفیق کو ملتزم بننے کے لئے تربیتی مراحل سے گزرنے سے مستثنیٰ قرار دیا جائے۔ ویسے اللہ تعالیٰ کے ہاں ''مسلمان'' کی **Gradation** ہوتی تو میں اُس کے کرم سے ''ملتزم'' ہو چکا ہوتا کیونکہ میں اپنی ضعیف العمری کے باوجود پچھلے ماہ عمرہ کے موقع پر ''ملتزم'' پر باب کعبہ کی چوکھٹ پکڑ پکڑ کر لپٹ لپٹ کر خوب رویا ہوں۔ چنانچہ ''ملتزم مسلمان'' تو بن گیا..... (باقی ہے ابھی رنگ میرے خون گلو میں)

میں **69** سال کا ضرور ہوں مگر الحمدللہ میرا جذبہ آج بھی وہی ہے جو کہ تحریک سے وابستہ ہوتے وقت **16** سال کی عمر میں تھا۔ خون میں ابھی تک حرارت ہے اور اب جبکہ ''تنظیم اسلامی'' میں گرم گرم تازہ خون داخل ہوا ہے تو میرا بھی گرم خون جوش مار رہا ہے۔ تو اے میرے محترم ناظم اعلیٰ مجھے تنظیم کی کسی بھی خدمت کے لئے قبول فرمالیں۔ میں کسی بھی کام اور کسی بھی جگہ (مقام) کے لئے حاضر ہوں۔ اللہ تعالیٰ شرف قبولیت عطا فرمائیں۔ آمین!

جس میں نہ ہو کشمکش موت ہے وہ زندگی
روحِ امم کی حیات کشمکشِ انقلاب

(قاضی عبدالقادر۔ اے **577**۔ بلاک بے' شمالی ناظم آباد' کراچی)

نقطۂ نظر کا اختلاف

✱ آپ کا خط اور ندائے خلافت کا ''نظریۂ پاکستان نمبر'' موصول ہوئے' جن کے لئے ممنون ہوں۔ جس مسئلے پر آپ نے میری رائے طلب کی ہے اس میں میرا نقطۂ نظر ذرا مختلف ہے۔ میری نگاہ میں دو قومی نظریہ کوئی نئی چیز نہیں۔ بلکہ بنیادی طور پر زندگی کے بارے میں ان دو نقطہ ہائے نظر کی طرف اشارہ کرتا ہے جن میں ایک الٰہی پر مبنی اور دوسرا الٰہی ہدایت سے بے نیاز ہو کر انسانی فکر اور تجربہ کی روشنی میں زندگی کے مسائل کے حل سے متعلق ہے۔ دو قومی نظریہ دراصل Idealogical & Civilizational Plurality کا دوسرا نام ہے اور اسی بنیاد پر اسلام خواہ اقلیت کا مذہب ہو یا اکثریت کا' اپنے منفرد کردار کا متقاضی ہے۔ نظریۂ پاکستان جیسا کہ آپ نے کہا ہے اسلام ہی ہے۔ لیکن ہمارے اپنے تاریخی اور تہذیبی پس منظر میں دو قومی نظریہ کی جو تشریح کی گئی ہے وہ عالمگیر دو قومی نظریہ کی جنوبی ایشیا کے مخصوص تناظر میں specific application تھی۔ یہی تحریک پاکستان کی صورت گر ہوئی اور اس طرح نظریۂ پاکستان دو قومی نظریہ کا وہ مظہر ہے جو برصغیر میں رونما ہوا۔ ایک ہی حقیقت کے دو مظہر ہیں۔ لمبی بحث تو ممکن نہیں لیکن مختصر انداز میں اس پورے مسئلہ کو دیکھتا ہوں اور آپ کو بھی اس کی دعوت دیتا ہوں۔

(پروفیسر خورشید احمد' رکن سینٹ آف پاکستان)

✱ اسلام کی جگہ مسلمان ہونا چاہئے تھا

شمارہ نمبر **35** میں محترمہ رعنا خان نے اپنے مکتوب میں شکایت کی ہے کہ ''نظریۂ پاکستان نمبر'' میں مسلمانانِ ہند کی شادی بیاہ کی رسموں کا ذکر کرتے ہوئے مضمون نگار نے ایک جگہ لکھا ہے ''مسلمانانِ ہند کی معاشرت میں ذات پات کی تفریق گھلی ہوئی ہے' جس کو اس لئے نہیں مٹایا جا سکا کہ خود اسلام میں فرقہ پرستی اور مسلک نوازی کی لعنت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔'' محترمہ کو اعتراض لفظ ''اسلام'' پر ہے جو کہ بجا ہے' کیونکہ اسلام تو خود فرقہ پرستی' مسلک نوازی اور قبائلی عصبیت کو مٹانے کے لئے آیا تھا اور دائماً اس کا یہی اصول و حکم ہے۔ دراصل مضمون نگار کو چاہئے تھا کہ وہ اسلام کی جگہ لفظ ''مسلمان'' لکھتے تو محترمہ کو شکایت کا موقع نہ ملتا۔ (رضوان علی' **10**۔ آر' ماڈل ٹاؤن' لاہور)

قلمی جہاد

✱ میرے سامنے اب ''ندائے خلافت'' کا تازہ شمارہ نمبر **33** ہے۔ میں یہ کچھ کہنے سے نہیں رک سکتا ہوں کہ آپ اپنی سعی اور قلمی جہاد سے اہل وطن کو باخبر کر رہے ہیں اور اس کے دستاویزی خصوصی شمارے ''فلسطین نمبر'' ''عراق نمبر'' ''اقبال نمبر'' اور ''نظریۂ پاکستان نمبر'' واضح ثبوت ہیں۔ لیکن کوئی شک نہیں شمارہ نمبر **33** بھی اہل وطن کے لئے ایک خصوصی شمارے کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس میں ملت اسلامی کے مایہ ناز اور وطن عزیز کا درد رکھنے والے معروف صحافی جناب عرفان احمد صاحب نے ایک نازک راز سے پردہ اٹھایا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پاکستان کی اکثریت ان سازشوں سے اوجھل ہے۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے کہ آپ نے ان کو اردو میں ترجمہ کر کے عام کیا اور ہم تک یہ معلومات پہنچائیں اور ساتھ ہی محبان وطن اور مخلصین وطن کی فہرست میں نام لکھوا دیا۔

فضل اللہ مہیر
مرکزی سیکرٹری اطلاعات' تنظیم فکر و نظر سندھ' سکھر

اسرائیل اور پاکستان کی مماثلتیں

ڈاکٹر علی آصف

* اسرائیل اور پاکستان کو اپنے قیام کے دوران اور بعد میں جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا' ان میں کافی مماثلت پائی جاتی ہے۔ جنرل ضیاء الحق نے دسمبر 1981ء میں جریدہ ''اکانومسٹ'' کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا تھا: ''پاکستان' اسرائیل کی طرح ایک نظریاتی مملکت ہے۔ یہودیت کو اسرائیل سے نکال دیا جائے تو وہ تاش کے پتوں کی طرح بکھر جائے گا' اور پاکستان میں سے اسلام کو نکال دیں اور اسے سیکولر بنا دیا جائے تو یہ بھی ٹوٹ پھوٹ جائے گا''۔

بنیادی فرق:

قیام سے پہلے یہودی 70 عیسوی کے بعد کبھی بھی' کہیں بھی اقتدار میں نہیں رہے۔ جبکہ مسلمان قرنِ اوّل سے 1857ء تک بڑے جاہ و جلال کے ساتھ مختلف علاقوں میں حکمرانی کرتے رہے۔

قیام کے بعد: قیام کے بعد دونوں ملکوں کی پالیسیوں میں جو بنیادی فرق تھا' وہ یہ تھا کہ اسرائیل نے پوری دنیا سے آنے والے یہودیوں کو قبول کیا جبکہ پاکستان نے صرف بھارت سے آنے والے مہاجرین کو قبول کیا۔

قیام سے پہلے کی جدوجہد میں مماثلت:

تحریک پاکستان اور تحریک اسرائیل کے ٹائم ٹیبل' ان کے رہنماؤں کا مذہبی اقدار سے دور ہونا' یہودیوں کا یورپ میں اور مسلمانوں کا ہندوستان میں اقلیت میں ہونا مماثلت کی نشانیاں ہیں۔

یہودیوں کی الگ سلطنت کی تحریک یعنی ''صیہونیت'' کا آغاز 1896ء میں ہو گیا تھا اور اس نے سیاسی زور 1917ء میں بالفور ڈیکلریشن اور مئی 1942ء بالٹی مور کانفرنس میں پکڑا تھا۔ اسرائیلی مملکت 14 مئی 1948ء کے میں قائم ہوئی۔ پاکستان کے سلسلے میں انیسویں صدی کے آخر میں علی گڑھ یونیورسٹی کا قیام' 1906ء میں مسلم لیگ کا قیام' 1930ء میں علامہ اقبال کا الگ وطن کے لئے مطالبہ' 1933ء میں پاکستان کا نام تجویز ہونا' 1940ء میں قراردادِ لاہور اور بالآخر 14 اگست 1947ء کو پاکستان معرضِ وجود میں آ گیا۔ دونوں ممالک اپنی آزادی سے قبل برطانوی راج کے ماتحت تھے۔ (مزید معلومات کے لئے ملاحظہ ہو ''ندائے خلافت کا فلسطین نمبر'')

دونوں ملکوں کے رہنما بین گوریان اور محمد علی جناح اپنی نجی زندگی میں مذہب سے کافی دور تھے۔ بین گوریان غیر مذہبی سوشلسٹ خیالات کا حامی تھا جبکہ جناح صاحب کا تعلق اسماعیلی آغا خان فرقے سے تھا۔ دونوں لیڈروں نے آزاد فلسطین اور آزاد ہندوستان میں اقلیت بن کر رہنے سے انکار کر دیا اور الگ وطن کا مطالبہ کیا۔

قیام کے بعد کے حالات میں مماثلت:

دونوں ممالک کو معرضِ وجود میں آنے کے بعد کافی مشکلات کا مقابلہ کرنا پڑا۔ یہ مشکلات ان کی جغرافیائی حدود' مہاجرین کی آمد اور زبان کی وجہ سے تھی۔

جغرافیہ:

اسرائیل کے پاس مشترکہ دارالحکومت تھا۔ اس کی چوڑائی 9 میل سے زیادہ نہ تھی لیکن 1967ء میں عرب اسرائیل جنگ کے نتیجے میں کافی تبدیلیاں آئیں۔ پاکستان کے دونوں حصوں میں تقریباً 1000 میل کا فاصلہ تھا۔ ان دونوں کے باشندوں کی زبان' لباس' تہذیب و تمدن' روایات و رسوم مختلف تھیں۔ لیکن 1971ء میں مشرقی پاکستان مغربی پاکستان سے جدا ہو کر بنگلہ دیش بن گیا۔

مذہبی جماعتوں کا رویہ:

قیام کے دوران مذہبی جماعتوں نے اپنے اپنے ملک کے قیام کو ناجائز قرار دیا۔ اس کے خلاف تحریکیں چلائیں۔ راسخ العقیدہ یہودیوں نے صیہونیت کی بھرپور مخالفت کی کیونکہ ان کے نزدیک اسرائیل کا قیام حضرت عیسیٰؑ کے ہاتھوں ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ ایک گروہ اب بھی اسرائیل کو تسلیم نہیں کرتا۔ یہی صورت حال پاکستان کے سلسلے میں بھی ہے۔ جمعیت العلماء ہند نے قیام پاکستان کی شدید مخالفت کی۔ مولانا ابوالکلام آزاد' مولانا حسین احمد مدنی' مفتی کفایت اللہ صاحب وغیرہم نے فتوے جاری کیے۔ قائداعظم کو کافر اعظم کہا گیا۔ جماعت اسلامی نے بھی مسلم لیگ کی قیادت میں قیام پاکستان کی مخالفت کی تھی۔

لیکن قیام کے بعد ان دونوں ملکوں کی مذہبی جماعتوں نے اقتدار کو اپنا حق سمجھا لیکن جب انہیں اقتدار حاصل نہ ہوا تو انہوں نے مذہبی اقدار کی بحالی کے لئے اپنی اپنی تحریکیں چلائیں۔ اسی وجہ سے 1949ء میں قراردادِ مقاصد منظور ہوئی۔ ایوب خان نے پاکستان کے نام کے ساتھ ''اسلامی جمہوریہ'' لگایا۔ اسرائیل کو اس کی مذہبی جماعتوں نے سیکولر بننے سے روکا ہوا ہے بلکہ وہ تو اب عظیم تر اسرائیل کے لئے کوششیں کر رہے ہیں۔

زبان کا مسئلہ:

دونوں ممالک میں زبان کا مسئلہ بھی دیکھنے میں آیا۔ دونوں ملکوں میں ایسی زبانوں کو قومی زبان قرار دیا گیا جن کے بولنے والے بہت تھوڑے تھے۔ جیسے اسرائیل میں عبرانی زبان کے بولنے والے بہت کم تھے لیکن اسے سرکاری زبان کا رتبہ دے دیا گیا۔ اور پاکستان میں بنگالیوں اور پنجابیوں کے اکثریت میں ہوتے ہوئے اردو زبان کو سرکاری زبان بنایا گیا جس نے بعد میں کافی مشکلات پیدا کیں۔

فرقہ واریت:

دونوں ملکوں میں مذہب کی صحیح تعریف پر ہمیشہ اختلاف رہا۔ اسرائیل میں یورپ کے Ashkenaz یہودی اور مشرق وسطیٰ کے Sepnardi یہودیوں میں ہمیشہ اختلاف رہا۔ اور اس کی وجہ سے 1977ء میں ایک اہم تبدیلی رونما ہوئی جس کا ذکر آگے آ رہا ہے۔ اسی طرح پاکستان میں شیعہ سنی فسادات ہوتے رہتے ہیں' اور قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینے کے لئے ملک میں کافی فسادات ہوئے اور آخر کار 1974ء میں انہیں غیر مسلم قرار دے دیا گیا۔

آئین کا مسئلہ:

دونوں ملکوں میں سیاسی انتشار کی وجہ سے آئین کا ہمیشہ مسئلہ رہا۔ اسرائیل میں اب تک باقاعدہ کوئی آئین نہیں بنایا گیا اور پاکستان میں کوئی آئین کچھ عرصے سے زیادہ قائم نہیں رہا۔ تین مرتبہ باقاعدہ آئین بنایا گیا اور متعدد بار ان میں ترامیم کی گئیں۔ اور آجکل بھی ایل ایف او کا مسئلہ ہے۔

اہم تبدیلی:

1977ء میں دونوں ممالک میں مذہب کا عنصر غالب رہا۔ اسرائیل میں نویں پارلیمانی (Knesset) الیکشن کے بعد لیبر پارٹی کو شکست ہوئی۔ بیگن صاحب وزیراعظم بن گئے اور ان کی پارٹی نے بیس سال بعد ایک انتہا پسند یہودی پارٹی کے ساتھ الحاق کیا اور وزارت خزانہ ⇦

اور تعلیم اس کے حوالے کردی۔ 1977ء میں پاکستان میں تحریک نظام مصطفیٰ چلائی گئی اور اس کے بعد جنرل ضیاء الحق نے ملک میں مارشل لاء نافذ کر دیا اور ملک کو ''اسلامی'' بنانے کی بھرپور کوشش کی۔

موجودہ حالات:

آج کل دونوں ملکوں میں مذہبی فرقوں کا کافی زور ہے۔ شیرون صاحب اسرائیل میں اور ایم ایم اے پاکستان میں کافی بڑی قوت بن کر ابھری ہیں۔

اسرائیل اور پاکستان کے ایک دوسرے کے ساتھ سفارتی تعلقات نہ ہونے کے باوجود مختلف جگہوں پر کشمکش نظر آتی ہے۔ پاکستان مسلسل فلسطین اور لبنان کو Support کر رہا ہے۔ جبکہ اسرائیل بھارت گٹھ جوڑ ہمارے لئے کافی تشویشناک ہے۔ پاکستان نے 48-1947ء میں اسرائیل کی بھرپور مخالفت کی تھی۔ جبکہ 68-1967ء میں بین گوریان نے پیرس میں کہا تھا کہ ہمیں ان عربوں سے نہیں بلکہ پاکستان سے خطرہ ہے۔

پاکستان اور اسرائیل نظریاتی ریاستیں ہونے کے باوجود اپنے اپنے نظریات پر قائم نہ رہ سکیں۔ اسرائیل نے روس کے یہودیوں کو یہودی ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ ان کو اپنے قبرستانوں میں جگہ نہ دی۔ اسی طرح برصغیر کے مسلمانوں کے لئے بننے والا ملک بھی تمام مسلمانوں کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں بلکہ ''سب سے پہلے پاکستان'' کے نعرے نے نظریہ پاکستان کی جڑوں کو کھوکھلا کر دیا ہے۔

ان دونوں ممالک میں اتنی مماثلتیں محض اتفاق ہے یا اس میں کوئی حکمت ہے عقل والوں کے لئے۔ واللہ اعلم۔ خدا ہمیں پاکستان کو اسلامی قلعہ بنانے میں ہمارا حامی و ناصر ہو۔

پڑوسی ملکوں کے ساتھ تعلقات:

اسرائیل کے اپنے پڑوسی ممالک کے ساتھ تعلقات ہمیشہ کشیدہ رہے ہیں۔ 1967ء میں عرب اسرائیل جنگ جس میں اسرائیل کو کامیابی ہوئی۔ فلسطین اور لبنان کے ساتھ وہ ابھی تک حالت جنگ میں ہے اور یہ چھوٹا سا ملک سب پر بھاری پڑ رہا ہے۔

پاکستان کے بھارت کے ساتھ تعلقات ابھی تک کشیدہ ہیں۔ 1965ء کی جنگ میں پاکستان کو کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ ستمبر 1965ء اور دسمبر 1971ء کی جنگوں میں بھارت اور پاکستان نے ایک دوسرے کو کافی نقصان پہنچایا۔ پاکستان کے اب افغانستان کے ساتھ بھی تعلقات کشیدہ ہیں۔ ایران کے ساتھ بھی تعلقات میں کچھ کشیدگی ہے جبکہ ایران اور بھارت کے باہمی تعلقات میں دوستی ہو رہی ہے۔

امریکہ کے ساتھ روابط:

دونوں ملکوں نے سرد جنگ کے دوران امریکا کا ساتھ دیا اور امریکہ دونوں ملکوں کو کافی امداد فراہم کرتا ہے لیکن پاکستان کو امریکی امداد کی وجہ سے ہمیشہ نقصان ہی اٹھانا پڑا ہے جبکہ اسرائیل کے لئے امریکی امداد بے حد مفید ثابت ہوئی ہے۔

پاکستان اور اسرائیل کے تعلقات:

حکومت پاکستان نے بے شک پہلے دن سے اسرائیلی مملکت کی بھرپور مخالفت کی ہے لیکن ہر دور میں چند پاکستانیوں نے اپنے دل میں اسرائیل کے لئے نرم گوشہ رکھا ہے۔ آیئے ایسی چند سیاسی تاریخی شخصیات پر نظر ڈالتے ہیں:

سر ظفر اللہ خان:

سر ظفر اللہ خان پاکستان کے پہلے وزیر خارجہ تھے۔ قادیانی تھے۔ وہ یہودی لابی کے ساتھ تقسیم ہند سے پہلے سے رابطے میں تھے۔ چنانچہ ستمبر 1945ء میں انہوں نے فلسطین کا دورہ کیا تھا لیکن اس سے پہلے ان کی ملاقات وائز مین سے ہوئی تھی جو بعد میں اسرائیل کے پہلے صدر بنے۔ اپنے دورے کے بعد ایک خط میں انہوں نے اپنے یہودی رہنما کو خط لکھا تھا جس میں انہوں نے اسرائیل کے لئے نیک تمناؤں کا اظہار کیا۔ فروری 1952ء میں انہوں نے اسرائیل کو عرب کا بازو قرار دیا۔ یہ قول انہوں نے قاہرہ' بغداد اور کراچی میں دہرایا۔

14 جنوری 1953ء میں اسرائیلی سفیر متعینہ اقوام متحدہ سے ظفر اللہ خان بے نیویارک میں ملاقات کی' جس میں ہمارے وزیر خارجہ نے انہیں بتایا کہ اس وقت تو حالات مشکل ہیں۔ خواجہ ناظم الدین کی حکومت مذہبی جماعتوں کے دباؤ میں ہے۔

ظفر اللہ خان جب نو سال کے لئے بین الاقوامی عدالت برائے انصاف کے ممبر منتخب ہوئے تو اس وقت وہ ایک ووٹ کے فرق سے کامیاب ہوئے تھے اور دنیا کو حیرت ہوئی تھی کہ اسرائیل نے رائے شماری میں حصہ نہیں لیا تھا۔

ذوالفقار علی بھٹو:

ذوالفقار علی بھٹو نے 1958ء میں جنیوا میں اقوام متحدہ کی ایک کانفرنس میں شرکت کی اور بعد میں اپنے اسرائیلی ہم منصب (Shabtai Rosenne) کے ساتھ کھانا کھایا۔ اس ملاقات کا حال روزینی یوں بیان کرتے ہیں:

''..... بھٹو عربوں کے بارے میں اپنی نفرت چھپا نہیں سکے۔ بے شک انہوں نے 1947ء کے پاکستانی فیصلے کی تائید کی لیکن حالات کو برا بھلا بھی کہا' اور افسوس کا اظہار کیا کہ وہ چاہتے ہوئے بھی اسرائیل کا دورہ نہیں کر سکتے۔ وہ اسرائیل کے ساتھ سماجی اور فوجی تعلقات رکھنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ہم اسرائیل کے بارے میں اپنی پالیسی فی الحال نہیں بدل سکتے' اور ابھی ہمیں کشمیر کا مسئلہ بھی حل کرنا ہے''۔ یہاں پر روزینی کہتے ہیں کہ میں نے بھٹو کو کشمیر کے حل میں اسرائیلی مدد کی یقینی دہانی کرائی تھی' بشرطیکہ وہ اسرائیل اور عرب دنیا کے تعلقات بہتر کرانے میں اپنا کردار ادا کریں' اس پر بھٹو نے مثبت جواب دیا تھا۔

ضیاء الحق:

ضیاء الحق نے 1981ء میں جریدہ ''اکانومسٹ'' کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا تھا کہ پاکستان اسرائیل کی طرح ایک نظریاتی مملکت ہے۔ یہودیت کو اسرائیل سے نکال دیا جائے تو وہ تاش کے پتوں کی طرح بکھر جائے گا اور اسلام کو پاکستان سے نکال کر اسے سیکولر بنا دیا جائے تو یہ بھی ٹوٹ پھوٹ جائے گا''۔

ضیاء الحق نے مارچ 1986ء میں فلسطین کی تنظیم آزادی (جس کے سربراہ یاسر عرفات ہیں) کو اسرائیل کو تسلیم کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ ضیاء صاحب پر اردن میں فلسطینیوں کے 1970ء کے قتل عام میں ملوث ہونے کا بھی الزام ہے۔ اس واقعے کو تاریخ ''بلیک ستمبر'' کے نام سے یاد رکھتی ہے۔ ضیاء الحق کی کوششوں سے مصر کو اوآئی سی کی ممبر شپ ملی جس نے اسرائیل کو کافی عرصہ پہلے تسلیم کر لیا تھا۔

بے نظیر بھٹو:

بے نظیر بھٹو کے بارے میں متعدد بار میڈیا میں خبریں آئی ہیں کہ ان کی ملاقات اسرائیلی حکام سے ہوتی رہتی ہے' لیکن حکومتی سطح پر ہمیشہ اس کی تردید کی گئی۔ چنانچہ اقوام متحدہ کی پچاس سالہ تقریب میں وزیر اعظم رابن سے بے نظیر صاحبہ کی ملاقات کافی عرصہ میڈیا میں گردش کرتی رہی جس کی تردید حکومت پاکستان نے متعدد بار کی۔ لیکن حال ہی میں اے آر وائی ٹی وی کو انٹرویو دیتے ہوئے بے نظیر نے کہا ایسی تقریبات میں آپ منہ پھیر کر نہیں بیٹھ سکتے' اسی لئے ملاقات خاص طور پر ہوئی تھی۔

نواز شریف:

نواز شریف کی پہلی وزارت عظمیٰ کے دور میں یہ الزام عائد کیا جاتا ہے کہ وہ اسرائیل کے ساتھ تعلقات پر نظر ثانی

> پاکستان اور اسرائیل دونوں نظریاتی ریاستیں ہونے کے باوجود اپنے اپنے نظریات پر قائم نہ رہ سکیں۔ پاکستان اسلام سے ہٹ گیا اور اسرائیل اپنے نظریہ سے۔

کرنا چاہتے تھے خاص طور پر جب جنوری 1992ء میں بھارت نے اسرائیل کے ساتھ مکمل سفارتی روابط قائم کر لئے تھے تب نواز شریف کے قریبی رفقاء نے بھارت جیسا قدم اٹھانے کے لئے انہیں متعدد بار مشورے دیئے تھے۔ ان میں صحافی نذیر ناجی بھی شامل ہیں۔ محترمہ عابدہ حسین نے اسرائیل کو تسلیم کرنے کے لئے کہا تھا۔

جمعیت العلماء اسلام (ق):

نواز شریف کے دور میں جمعیت العلماء اسلام کے ایک نسبتاً کم معروف اور غیر اہم دھڑے یعنی ق گروپ کے مرکزی رہنماء مولانا اجمل قادری نے اسرائیل کا دورہ کیا تھا اور واپسی پر اسے تسلیم کرنے کے لئے کہا تھا۔ یہ بھی فرمایا تھا کہ پاکستان کو دوسروں کی جنگ نہیں لڑنی چاہئے۔ اس کے تھوڑے ہی عرصے بعد ایک اور مذہبی رہنماء ضیغم خان نے بھی یہی باتیں دہرائی تھیں۔ شریف کابینہ کے سینئر رہنما صدیق الفاروق نے بھی اسرائیل کو تسلیم کرنے کی بات کی تھی۔

صدر رفیق تارڑ:

اسرائیلی جریدہ Yedioth Anronoth نے 30 اکتوبر 1998ء کے شمارے میں صدر ایزار وائز مین اور صدر رفیق تارڑ کی انقرہ میں جدید ترکی کی 75 سالہ تقریب میں ملاقات کو یوں بیان کیا کہ صدر پاکستان نے وائز مین کی طرف پیش قدمی کی، ہاتھ ملایا اور فرمایا:

"I have heared a great deal about as a man of peace."

اور آخر میں فرمایا: "One day we will meet again."

جنوری 1996ء میں اسرائیلی جریدے Yedioth Anronath نے بے نظیر کا انٹرویو شائع کیا جس میں انہوں نے رابن کے قتل کی سختی سے مذمت کی اور اسرائیل کا F-16 پر پاکستانی موقف کو سمجھنے پر شکریہ ادا کیا۔

ڈاکٹر اسرار احمد کی شاہکار تصنیف

اسلام کے انقلابی فکر کی تجدید و تعمیل

اور

اس سے انحراف کی راہیں

(قیمت: 48 روپے)

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن
36۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور

کوئی تو ہو جو جنرل مشرف کو جگائے!

* سیاسی تجزیہ نگاروں کا کہنا ہے کہ جب تک امریکہ پاکستان کی موجودہ فوجی حکومت کے ساتھ ہے، پاکستانی عوام حبس کے ماحول میں رہیں گے۔ ان کے کسی واویلے پر موجودہ فوجی حکومت کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگے گی اور یوں فوج اپنے ایجنڈے پر عمل کرتی رہے گی۔ عوام کی طرف سے ملک میں بڑھتی ہوئی غیر ملکی مداخلت پر احتجاج کے جواب میں فوجی حکومت کا ٹس سے مس نہ ہونا بھی دراصل عالمی طاقتوں کے ایجنڈے پر من وعن کورنش بجالانا ہے۔ ویسے بھی آئے دن ہماری پیاری فوجی حکومت واشنگٹن کے راستے میں پھول اور عوام کی راہ میں ببول بکھیرتی ہی رہتی ہے لیکن جنرل مشرف نے 22 ستمبر کو اپنے حالیہ دورۂ امریکہ کے موقع پر اے۔ بی۔ سی نیوز کے منجھے ہوئے 22 سال پرانے اینکر مین پیٹر جینگز Peter Jennings کو انٹرویو دیتے ہوئے نہ صرف یہ ثابت کیا ہے کہ وہ اپنے منہ میں صرف امریکہ کی زبان رکھتے ہیں بلکہ پاکستانی عوام کے زخموں پر نمک پاشی کا گھناؤنا جرم بھی انجام دیا ہے۔

پیٹر جینگز کے اس سوال کے جواب میں ''آپ کیوں ایسا سمجھتے ہیں کہ آپ کے عوام امریکہ سے نفرت کرتے ہیں؟'' جنرل مشرف نے کہا کہ فی الوقت دنیا بھر میں جتنے فتنے سر اٹھائے ہوئے ہیں اور 90 کی دہائی سے لے کر اب تک کی اس سرد جنگ میں مسلمان ہی ملوث نظر آتے ہیں اور چونکہ اس بات کی توقع کی جاتی ہے کہ شاید مسلمان ہی غلطی پر ہوں، یہی میرا ایسا سمجھنے کی بڑی وجہ ہے۔ جنرل مشرف کے اس جواب کو متوازن اور منصفانہ نہیں کہا جاسکتا۔ ایسا گول مول جواب ان کو واضح طور پر امریکہ کے دباؤ میں ظاہر کر رہا ہے۔ اس سوال کے جواب میں کہ ''آج کا پاکستان مذہبی انتہا پسندی کے حوالے سے گزشتہ دس برسوں کے مقابلے میں کہیں آگے ہے؟'' جنرل مشرف نے کہا ہے کہ مذہبی انتہا پسندی پاکستان میں پھل پھول نہیں سکے گی کیونکہ پاکستانی عوام کی اکثریت ''ماڈریٹ'' ہے۔ مذہبی انتہا پسند جو کہ اس وقت میدانِ سیاست میں آگے ہیں لیکن ان کا کوئی مستقبل نہیں ہے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ اب بھی پاکستان میں ماڈریٹ قوتیں ہی چھائی ہوئی ہیں۔ جنرل مشرف نے یہ نہیں بتایا کہ یہ ماڈریٹ کوئی مذہب ہے یا فقط ان کا تکیہ کلام! ایک سوال جو کہ اسلام اور امریکہ کے حوالے سے کیا گیا کہ ''کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ یونائیٹڈ اسٹیٹ اور اسلام کے مابین خطرناک ٹکراؤ ہو سکتا ہے؟'' جنرل موصوف یوں گویا ہوئے کہ ہاں میں ایسا سمجھتا ہوں اور یو۔ این۔ او کی جنرل اسمبلی کے اپنے خطاب میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میڈیا نے اسلام کا جو امیج لوگوں کے ذہن میں بنا دیا ہے اس پر صرف مذہبی انتہا پسند عمل پیرا ہیں وہ ان کا اپنا خود ساختہ اسلام ہے۔ جبکہ درحقیقت اسلام سیکولر ہے اور تمام زمانوں کے لئے ماڈرن ہے لیکن بدقسمتی سے مذہبی انتہا پسندوں نے اسلام کا غلط تعارف کرا رکھا ہے۔ جنرل مشرف نے یہ نہیں کہا کہ اسلام امن وسلامتی کا پرچار کرتا ہے۔ اسلام کو سیکولر وہ امریکہ کی خواہش کے عین مطابق کہہ رہے ہیں۔ جنرل مشرف کے اس سٹ۔ ڈاؤن انٹرویو کو دیکھتے ہوئے مجھے برسوں پہلے سہیل رعنا کا پاکستان ٹیلی ویژن سے نشر کیا جانے والا پروگرام ''رنگ برنگی دنیا'' یاد آتا رہا جس میں ایک روبوٹ بھیا ہوا کرتے تھے۔ سہیل رعنا اُن سے بالکل ایسے ہی سوال پوچھا کرتے تھے جیسے پیٹر جینگز نے جنرل مشرف سے پوچھے اور روبوٹ بھیا رٹے رٹائے جواب دیا کرتے تھے جیسے جنرل مشرف نے دیئے۔ کوئی ہے جو جنرل مشرف کو جگائے اور انہیں بتائے کہ جہاں پاکستان بین الاقوامی مفادات کی آماجگاہ بنتا جارہا ہے وہیں ان کی حیثیت بھی عالمِ اسلام کے خلاف برسرِ پیکار قوتوں کے ہاتھ میں مہرہ نا چیز سے زیادہ نہیں۔ یہ تمام قوتیں سراسر عالمِ اسلام اور شعائرِ اسلام کے خلاف ہیں۔ جنرل مشرف ان ہی کی زبان بولتے ہیں لیکن پھر بھی کبھی شمالی کوریا کے ساتھ ایٹمی تعاون کا الزام پاکستان پر لگایا جاتا ہے تو کبھی دہشت گردی کی جڑیں پاکستان میں تلاش کی جاتی ہیں۔ جنرل مشرف جان لیں کہ ان تمام چیلنجز سے عہدہ برآ ہونے کے لئے اسلام کو سیکولر مذہب نہیں بلکہ مکمل دین اور ضابطے کی حیثیت سے خود پر اور وطنِ عزیز پر لاگو کرنا ہوگا۔

❁ ❁

محترم ڈاکٹر اسرار احمد سے سوال و جواب کی نشست

س: دادا کی زندگی میں بیٹا وفات پا جائے تو پوتوں کو جائیداد نہیں ملتی۔ کیا نبی اکرم ﷺ کی زندگی میں اس کا کوئی فیصلہ نہیں ملتا؟ مزید یہ کہ کیا باپ اپنی زندگی میں جائیداد اپنی اولاد میں تقسیم کر سکتا ہے؟ وضاحت فرمائیں۔

ج: یہ دو سوال ہیں۔ وراثت میں تو یتیم پوتے کا حصہ نہیں ہے' لیکن دادا اپنی جائیداد میں ایک تہائی کی حد تک یتیم پوتوں کے لئے وصیت کر سکتا ہے اور اپنی زندگی میں وہ تقسیم کر سکتا ہے۔ وہ جس طرح چاہے کرے' البتہ اس میں کسی جائز وارث کو حق سے محروم کرنے کی نیت نہیں ہونی چاہئے۔ اس صورت میں وہ اللہ کے ہاں پکڑا جائے گا۔ باقی یہ کہ کوئی واقعی ضرورت ہو تو اس کے لئے وہ اپنی زندگی میں ہبہ کر سکتا ہے۔ ہبہ کے ساتھ قبضہ ضروری ہوتا ہے' یعنی ہبہ کر کے قبضہ بھی دیا جائے۔

س: اللہ سے دعا کرتے وقت اس کی قبولیت پر کس حد تک یقین رکھنا ضروری ہے؟

ج: پوری حد تک یقین ضروری ہے' اس لئے کہ دعا کبھی ضائع نہیں جاتی۔ وہ لازماً قبول ہوتی ہے' لیکن حضور ﷺ نے اس کی قبولیت کی تین شکلیں بیان فرمائی ہیں۔ اول' جو چیز انسان مانگ رہا ہے' اگر اللہ کے علم میں وہ چیز اس کے حق میں اچھی ہے تو اللہ اسے وہی شے دے دیتا ہے۔ دوم' اپنی کم علمی کی وجہ سے اگر وہ ایسی شے مانگ رہا ہے جو حقیقت میں اس کے لئے مفید نہیں ہے' کیونکہ اللہ جانتا ہے وہ نہیں جانتا' تو اللہ تعالیٰ اس کی بجائے کوئی اور اچھی چیز اس کو دے دیتا ہے۔ تیسری صورت میں اللہ تعالیٰ اس دعا کو توشۂ آخرت بنا لیتا ہے اور آخرت میں وہ اس کے لئے اللہ تعالیٰ کے ہاں اجر کا ذریعہ بن جائے گی۔ تو گویا کوئی دعا ناکام نہیں ہوتی۔

س: کیا عورت کو مسجد میں نماز پڑھنے سے حضور پاک ﷺ کے دور میں منع کیا گیا یا صحابہ کرامؓ کے دور میں؟ اور اگر عورتوں کو مسجد میں نماز پڑھنے سے منع کیا گیا ہے تو جمعۃ المبارک اور عیدین کے موقع پر عورتوں کے لئے مسجد میں انتظام کیوں کیا جاتا ہے' حالانکہ اس موقع پر تو اجتماع عام موقعوں سے زیادہ ہوتا ہے؟

ج: حضور ﷺ کے زمانے میں اس حوالے سے کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ خواتین مسجد میں آتی تھیں' ان کی صفیں مردوں سے پیچھے بنتی تھیں اور وہ جماعت حضور ﷺ کی امامت میں ادا کرتی تھیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں بھی کوئی پابندی نہیں ہوئی۔ ان کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس پر پابندی لگائی ہے۔ ان کا خیال تھا کہ حالات اب خراب ہو رہے ہیں اور لوگوں کے دل اور نگاہیں اب اتنی پاک نہیں رہی ہیں جیسی کہ ہوتی تھیں تو انہوں نے عورتوں پر پابندی لگا دی۔ ویسے حضور ﷺ کی احادیث میں بھی یہ تاکید ملتی ہے کہ عورت کی نماز اپنے گھر میں افضل ہے۔ مرد کی نماز جماعت کے ساتھ افضل ہے' جس پر اسے ستائیس' اٹھائیس گنا زیادہ اجر ملے گا' جبکہ عورت کی نماز اپنے گھر میں افضل ہے اور گھر میں بھی صحن سے زیادہ افضل دالان میں ہے' دالان سے زیادہ افضل کمرے میں ہے' کمرے سے زیادہ افضل کوئی بغلی کوٹھڑی اگر ہے تو اس میں ہے۔ یہ حضور ﷺ کی حدیث ہے جو میں آپ کو سنا رہا ہوں۔ اس لئے کہ عورت مستور یعنی چھپی ہوئی شے ہے۔ اسی لئے خواتین کو مستورات بھی کہا جاتا ہے۔ تو جتنی زیادہ سے زیادہ چھپی رہے' اتنا ہی اچھا ہے۔ البتہ عیدین میں اور جمعے میں چونکہ خطبہ ہوتا ہے' اس لئے خاص طور سے تاکید تھی کہ عورتیں ضرور آئیں تاکہ حضور ﷺ کی تعلیم اور تلقین سے اور خطبے میں جو نصیحتیں ہوتی ہیں ان سے وہ آگاہ رہیں۔ آج اسی حوالے سے بعض مساجد میں اس کا اہتمام ہوتا ہے' جبکہ اکثر مساجد میں اہتمام نہیں ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اب اس کی اتنی زیادہ ضرورت بھی نہیں رہی' اس لئے کہ اب کتابیں ہیں' رسالے ہیں' پھر مسجد میں جو تقریر ہوتی ہے اس کے آڈیو پول سکتے ہیں جن کو سنا جا سکتا ہے۔ تو اس بارے میں زیادہ افضل یہی ہے کہ گھر پر ہی نماز پڑھی جائے۔ ویسے بھی عورت پر جمعہ فرض نہیں ہے۔

س: میرے خاوند نے مجھے دو طلاقیں تحریری طور پر بھیج دی ہیں اور تین ماہ کی مدت پوری ہو گئی ہے۔ میں اس شخص کے ساتھ رہنا نہیں چاہتی کیونکہ ہمارا ساتھ رہنا شرعاً ٹھیک نہیں ہے۔ میری دو بچیاں اس کے پاس ہیں۔ قرآن و سنت کی روشنی میں کچھ رہنمائی فرمائیں۔

ج: اگر اس نے دو طلاقیں تحریری دی تھیں اور اس کے بعد عدت پوری ہو گئی ہے' یعنی تین مرتبہ حیض آ چکا ہے تو پھر آپ اب فارغ ہیں' آپ جس سے چاہیں نکاح کر سکتی ہیں۔ سابقہ شوہر سے بھی' اگر وہ دوبارہ نکاح کرنا چاہے' تو یہ آپ کی مرضی پر ہے کہ اس کے ساتھ نکاح کریں یا نہ کریں۔ عدت سے پہلے پہلے وہ رجوع کرنے کا حق رکھتا تھا' اس میں آپ کی مرضی کو دخل نہیں تھا' عدت پوری ہو گئی ہے تو اب اس کا وہ اختیار اور حق ختم ہو چکا ہے۔ اب آپ اگر چاہیں' مرضی ہو تو اس سے نکاح کر لیں' ورنہ نہیں۔

س: کیا اس کی کوئی سند موجود ہے کہ دنیا میں ایک لاکھ چوبیس ہزار نبی آئے؟

ج: یہ بعض روایات میں ہے۔ ان روایات کی سند کے اعتبار سے کیا حیثیت ہے' یہ میرے علم میں نہیں۔ لیکن یہ بات بہت زیادہ عام بیان ہوتی ہے کہ سوا لاکھ انبیاء اور تین سو تیرہ رسول بھیجے گئے۔ 313 کی تعداد غزوۂ بدر میں شریک صحابہ کرامؓ کی بھی ہے اور سوا لاکھ افراد حضور ﷺ کے خطبہ حجۃ الوداع کے موقع پر موجود تھے۔ یہ عدد ملتے جلتے ہیں۔ واللہ اعلم!

س: آپ کے آج کے خطاب سے یہ ثابت ہوا ہے کہ اسلام قیامت سے پہلے پورے عالم میں پھیلے گا لیکن اس وقت جس حالت میں ہم ہیں' کیا یونہی مسلسل یہودیوں اور عیسائیوں کے ظلم کا شکار رہیں گے؟

ج: ابھی تو عیسائیوں اور یہودیوں کا بہت زیادہ ظلم ہمیں جھیلنا ہے' خاص طور پر عربوں کو' کیونکہ امت مسلمہ میں زیادہ بڑے مجرم عرب ہیں' اس لئے کہ ان کی اپنی مادری زبان میں اللہ کا قرآن موجود ہے اور پھر بھی وہ اس کی پیروی نہیں کر رہے! آپ کو تو قرآن سمجھنے کے لئے یا میرے درس میں آنا پڑتا ہے یا کسی کی تفسیر پڑھنی پڑتی ہے یا اللہ تعالیٰ توفیق اور ہمت دے تو آپ عربی سیکھیں اور تب کہیں جا کر وہ بات سمجھ میں آئے گی۔ عربوں کی تو مادری زبان میں ہے' پھر بھی انہوں نے قرآن کو اپنا نظام نہیں بنایا' اپنا امام نہیں بنایا تو وہ بہت بڑے مجرم ہیں۔ اس کی سزا انہیں مل بھی رہی ہے' ذلت اور مسکنت ان پر طاری ہے اور بہت بڑا ہلاکت کا مسئلہ ابھی آنے والا ہے۔ یہ جو بھی اب آرمیگاڈان یا المحمۃ العظمیٰ ہو گی اس میں بہت شدید نقصان عربوں کا ہو گا۔ لیکن یہ کہ ہم بھی بچے ہوئے نہیں ہیں۔ نمبر دو مجرم ہم مسلمانانِ پاکستان ہیں کہ ہم نے اسلام کے نام پر ایک ملک بنایا' جس کی تحریک میں لاکھوں انسان قتل ہوئے اور ہزارہا عورتوں کی عصمتیں لوٹی گئیں۔ جو عورتیں اغوا ہوئیں' پھر وہ سکھوں کے گھر میں ہی رہ گئیں۔ انہیں جب پچاس کی دہائی کے وسط میں کلیم کرنے کی کوشش کی گئی تو انہوں نے آنے سے انکار کر دیا۔ جو مسلمان انہیں یہاں سے لینے کے لئے گئے تھے ان سے انہوں نے کہہ دیا کہ اب آئے ہو ہمیں لینے کے لئے جب ہمارے ہاں دو دو' تین تین بچے ہو چکے ہیں۔ کہاں سن 47' کہاں 54'55۔ اب ہم تمہارے یہاں جائیں گی تو ہمیں قبول کون کرے گا؟ کون ہم سے شادی کرے گا؟ لہٰذا وہ نہیں آئیں۔ آپ سوچئے! امت کی بیٹیاں سکھوں اور ہندوؤں کے ہاں رہ گئیں! ان سب قربانیوں کی قیمت پر اسلام کے نام پر ہم نے پاکستان بنایا' اور اسلام نافذ نہیں کیا۔ یہ میں نہیں کہہ سکتا کہ کس قدر بڑی سزا ہمارے اوپر اللہ کی طرف سے ابھی آنے والی ہے۔ واللہ اعلم!

نواب زادہ نصر اللہ خان
(2003-1918)

پاکستان کے بزرگ سیاسی رہنما' بابائے جمہوریت 27 ستمبر 2003ء کی شب کو اسلام آباد میں 85 سال کی عمر میں رحلت کر گئے۔ ان کے آباء واجداد اٹھارویں صدی کے اواخر میں افغانستان کے علاقے غزنی سے آ کر ملتان سے 38 میل کے فاصلے پر واقع قصبے خان گڑھ میں آ کر آباد ہوئے۔ 1918ء میں پیدا ہوئے۔ چھ برس کی عمر میں والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ ان کے والد نواب محمد سیف اللہ خان مجسٹریٹ تھے اور اسلام سے کافی لگاؤ رکھتے تھے۔ سرسید احمد خان کی مسلم ایجوکیشنل کانفرنس' علی گڑھ سے بھی وابستہ رہے۔ انہوں نے اپنے علاقے میں دینی مدارس' مساجد اور عیدگاہ تعمیر کی۔ ان کے واحد فرزند نصر اللہ خان نے ایچی سن کالج لاہور سے ایف اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد ایمرسن کالج ملتان میں گریجویشن کرنے کے لئے داخلہ لیا' لیکن فائنل امتحان سے قبل ان کی والدہ نے ان کی شادی خاکوانی قبیلے میں ٹھہرا دی اور یوں انہیں کالج کی تعلیم چھوڑنی پڑی۔

نوجوانی ہی سے سیاسی بصیرت اور جوش ولولہ ان کی شخصیت میں رچا ہوا تھا۔ انگریز دشمنی کا عنصر بھی شامل تھا۔ 1930ء میں انہوں نے اپنی سیاسی زندگی کا آغاز مجلس احرار سے کیا اور سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کی خطابت کے سائے میں سیاسی تربیت حاصل کی۔ قیام پاکستان کے بعد ''مجلسِ احرار'' کا انگریز دشمنی کا کردار ختم ہوا تو اس نے تحفظ ختم نبوت کا محاذ سنبھال لیا' اور اس محاذ پر نصر اللہ خان مضبوطی سے آخر دم تک ڈٹے رہے۔ 1950ء میں وہ مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے پنجاب اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے' لیکن اختلافات کی بنا پر مسلم لیگ سے علیحدہ ہو کر حسین شہید سہروردی کے تعاون سے ''عوامی لیگ'' بنائی۔ بعد ازاں عوامی لیگ سے بھی علیحدگی اختیار کر لی اور ''جمہوری پارٹی'' کے نام سے اپنی سیاسی پارٹی الگ بنالی جسے لوگ ازراہِ مزاح ''تانگہ پارٹی'' کہتے تھے۔ لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ وہ اپنی اکیلی ذات میں جماعت تھے اور بڑی بڑی سیاسی جماعتیں اپنے احیاء کے لئے یا اپنے اپنے منشور کی بقاء کے لئے ان کی سربراہی میں' ان کے مکان کی چھت تلے جمع ہوا کرتی تھیں۔

نواب زادہ نصر اللہ خان نے صدر ایوب کے خلاف محترمہ فاطمہ جناح کا ساتھ دیا اور ان کی انتخابی مہم بڑے بھرپور انداز میں چلائی۔ 1967ء میں ڈیموکریٹک ایکشن کمیشن' 1973ء میں یونائیٹڈ ایکشن فرنٹ اور 1977ء میں پاکستان نیشنل الائنس (پی این اے) کی تشکیل و تحریک میں اہم کردار ادا کیا۔ 1977ء کے الیکشن میں وہ پی این اے کے ٹکٹ پر ہی قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے' لیکن جب ذوالفقار علی بھٹو اور ان کی پیپلز پارٹی کے خلاف پی این اے کی احتجاجی تحریک شروع ہوئی تو اس میں قائدانہ کردار ادا کیا' جس کی پاداش میں انہیں لاہور کے ایک جلوس میں حملہ کرا کے زخمی کر دیا گیا۔ بعد میں جب بھٹو صاحب کے ساتھ مذاکرات ہوئے تو پی این اے کی سہ رکنی ٹیم میں مولانا مفتی محمود اور پروفیسر غفور احمد کے ساتھ وہ بھی شریک تھے۔ بے نظیر بھٹو نے پہلے دورِ حکومت میں نصر اللہ خان صاحب نے غلام اسحاق خان کے خلاف صدارتی انتخاب لڑا جس میں کامیابی نہ ہو سکی۔ انہیں کشمیر کمیٹی کا چیئرمین بنایا گیا۔ انہوں نے اپنے دور میں غیر ملکی دورے کر کے کشمیر کا مسئلہ دنیا بھر میں اجاگر کیا۔ 1990ء میں آل پارٹیز کانفرنس میں اہم کردار ادا کرنے کے بعد 1992ء میں نیشنل ڈیموکریٹک الائنس قائم کی۔ وہ فوجی حکومت کے سخت خلاف تھے' چنانچہ ایوب خان' یحییٰ خان' ضیاء الحق' پرویز مشرف کی فوجی آمریتوں کے خلاف انہوں نے سخت جدوجہد کی اور ہر طرح کی قید و بند کی صعوبتیں ہنسی خوشی برداشت کیں۔ 1953ء اور 1974ء میں تحفظ ختم نبوت کی تحریکوں میں قائدانہ رول ادا کیا۔

نواب زادہ نصر اللہ خان اعلیٰ اخلاقی اقدار اور اوصافِ حمیدہ پر عمل کرنے والے وضع دار بزرگ تھے۔ اچکن' ٹوپی اور حقہ ان کی ذاتی شناخت' جمہوریت ان کا ایمان اور احیائے جمہوریت ان کی زندگی بن چکی تھی۔ وہ صحافی بھی تھے' اور ادیب اور شاعر بھی۔ قیام پاکستان سے قبل روزنامہ ''آزاد'' کے ایڈیٹر تھے۔ جب سکھ لیڈر ماسٹر تارا سنگھ نے پنجاب اسمبلی لاہور کی سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر اپنی کرپان لہرا کر ملک میں آگ اور خون کا دریا بہانے کی دھمکی دی تھی تو نواب زادہ صاحب نے ایک اداریہ لکھا تھا جس کے خلاف مقدمہ قائم ہوا جو قیام پاکستان کے بعد داخل دفتر ہوا۔ ان کی رحلت سے فی الحقیقت ایک ایسا خلاء پیدا ہو گیا ہے جو طویل عرصے تک پر نہ ہو سکے گا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون○○

نمونۂ کلام

نواب زادہ نصر اللہ خان اگرچہ سرائیکی بولتے تھے' لیکن اُردو کے بہت اچھے شاعر تھے۔ فوجی و سیاسی آمریت کے خلاف اپنی بے بسی کا منظوم اظہار اکثر کرتے رہتے تھے یہ دو نظمیں مقبولِ عام ہوئیں:

کہیں تو کس سے کہیں چشمِ اشک بار کی بات
شبِ فراق کا فسانۂ انتظار کی بات
عذابِ مرگِ تمنا' دلِ فگار کی بات
مرے وطن کی کہانی' مرے دیار کی بات
گراں گزرتی ہے صیاد کی طبیعت پر
کبھی جو کرتے ہیں اہلِ قفس بہار کی بات
زباں پہ لا نہیں سکتے' حدیثِ لالہ رُخاں
قلم سے لکھ نہیں سکتے' قدِ نگار کی بات
عجب یہ ہے' ترے دیوانے' پھر بھی کرتے ہیں
فضائے جبرِ مسلسل میں اختیار کی بات

☆☆☆

کتنے بیدرد ہیں صرصر کو صبا کہتے ہیں
کیسے ظالم ہیں کہ ظلمت کو ضیاء کہتے ہیں
جبر کو میرے گناہوں کی سزا کہتے ہیں
میری مجبور کو تسلیم و رضا کہتے ہیں
غم نہیں گر لب اظہار پہ پابندی ہے
خامشی کو بھی تو اِک طرز نوا کہتے ہیں
کشتگانِ ستم و جور کو بھی دیکھ تو لیں
اہلِ دانش جو جفاؤں کو وفا کہتے ہیں
کل بھی حق بات جو کہنی تھی سرِ دار کہی
آج بھی پیشِ بتاں نامِ خدا کہتے ہیں
یوں تو محفل سے تری اٹھ گئے سب دل والے
ایک دیوانہ تھا وہ بھی نہ رہا کہتے ہیں
یہ مسیحائی بھی کیا خوب مسیحائی ہے
چارہ گر موت کو تکمیلِ شفا کہتے ہیں
بزمِ زنداں میں ہوا شور سلاسل برپا
دہر والے اسے پائل کی صدا کہتے ہیں
آندھیاں میرے نشیمن کو اڑانے اٹھیں
میرے گھر آئے گا طوفان بلا کہتے ہیں
مصلحت کیش اسے رنگ حنا کہتے ہیں
میری فریاد کو اس عہد ہوس میں ناصر
ایک مجذوب کی بے وقت صدا کہتے ہیں

سید احمد شہید کی تحریک جہاد اور مسلمانوں کے مختلف طبقوں کی محرومی

تحقیق و تحریر: سید قاسم محمود

* سید احمد اور ان کے رفقاء جب حج کے لئے روانہ ہوئے تو اس وقت بھی ان کو اپنی آخری منزل یعنی تحریک جہاد کا علم تھا کیونکہ وہ محسوس کر رہے تھے کہ اس ''دارالحرب'' میں مزید توقف نہیں کیا جا سکتا۔ حج کے لئے سفر کے دوران میں جب سید احمد اور ان کے رفقاء کو بے مثال مقبولیت حاصل ہوئی اور مسلمانوں نے زبردست جوش و ولولے کا اظہار کیا' تو اس سے ان کے ارادوں میں مزید پختگی آ گئی اور حج کے دوران میں بھی یہ عزم ان کے سامنے رہا۔ انہوں نے عقبہ کے مقام پر اپنے ساتھیوں سے جہاد کی بیعت لی۔ جب آپ واپس آئے تو پھر بھی یہی مقصد سامنے تھا۔

سید احمد جب ہندوستان واپس لوٹے تو برصغیر میں انگریزوں کا تسلط قریب قریب مکمل ہو چکا تھا۔ صرف پنجاب' سرحد اور سندھ ان کے تسلط سے باہر تھا لیکن حالت اُن صوبوں کی بھی بہتر نہ تھی۔ یہی وہ حالت تھی جس نے شاہ عبدالعزیز کو مجبور کیا تھا کہ وہ اس تحریک کی تنظیم کے لئے سید احمد کو آگے بڑھائیں اور یہ شاہ ولی اللہ کی تحریک کا ہراول دستہ بنیں۔ اُس زمانے کا سیاسی نقشہ شدید طور پر مایوس کن تھا۔ برطانوی تسلط صرف فوجی طور پر ہی مکمل نہیں ہو چکا تھا' بلکہ پورے نظم و نسق کو برطانوی حکومت نے سنبھال لیا تھا۔ نظم و نسق کا پرانا ڈھانچا ٹوٹ رہا تھا اور اب اس ڈھانچے میں ہندوستانی اور مسلمانکے لئے کوئی جگہ نہ تھی۔ ایک ایک کر کے ہندوستانیوں کو ان کے عہدوں سے ہٹایا اور ملازمتوں سے الگ کیا جا رہا تھا۔ یہ محرومی کس قدر بھیانک تھی' اس کا اندازہ خود انگریزوں نے کچھ دنوں بعد کیا۔ لیکن ایک بات یقینی ہے کہ اس محرومی نے سب سے زیادہ مسلمان آبادی کو متاثر کیا۔ اس لئے کہ مسلمانوں کا اہل علم طبقہ اب تک ملازمتوں سے وابستہ رہا تھا اور ملکی حکومت کی انتظامیہ کا واحد ستون مسلمانوں کا یہ اہل علم طبقہ ہی تھا۔ اب اس طبقے کی محرومی نے زبردست اضطراب پیدا کر دیا۔ زمینداری نظام کی اتھل پتھل اس سے پہلے ہی مسلمانوں کو متاثر کر چکی تھی۔ اب اس نئی افتاد نے رہی سہی کسر پوری کر دی۔ اسی لئے یہ کوئی حیران کن بات نہیں کہ سید احمد کی تحریک کو اس اہل علم طبقے اور پرانے متمول خاندان کی بھی خاصی تائید و حمایت حاصل ہوئی۔

اس زمانے کے متعلق لارڈ ولزلی نے بورڈ آف ڈائریکٹرز کو اپنی رپورٹ بھیجتے ہوئے لکھا تھا:

''ہندوستان میں ہمارے تسلط کے اصول و قواعد اور آئین میں سب سے بڑی خامی اور کوتاہی یہی ہے کہ ہم نے کوئی قدم اس سمت نہیں اٹھایا جس سے ہم اپنی رعایا کا دل موہ سکیں' نہ ہی ہم نے اس کے جذبۂ بے وفائی کو قابو میں کرنے کی کوئی سبیل کی ہے۔ کیونکہ کل تک جو حکومت چلا رہے تھے' ان کو ہم نے ہر قسم کے اختیار و اقتدار سے محروم کر دیا ہے' ان کی عزت خاک میں ملا دی ہے اور ان کو روپے پیسے کا محتاج کر دیا ہے۔ اس کے بدلے میں ان کو کچھ نہیں دیا گیا جس سے اُن کی ان محرومیوں کی تلافی ہو سکے۔''

> جس طرح بارش سے نباتات اور حیوانات اور انسانوں کو بکثرت فوائد پہنچتے ہیں' اسی طرح جہاد سے عام خلائق کو نفع پہنچتا ہے

ولزلی نے یہ رپورٹ 1799ء میں بورڈ آف ڈائریکٹرز کو بھیجی تھی' اس سے واضح ہے کہ یہ عمل کتنا پہلے شروع ہو چکا تھا اور اضطراب اور بے چینی کس طرح مسلم معاشرے کا ایک جزو لاینفک بنتی جا رہی تھی۔ اس اضطراب اور بے چینی کا احساس تحریک جہاد کے قائدین کو خود بھی تھا اور تجدید و احیائے دین کا صحیح نظر اسی اضطراب اور بے چینی کے ازالے کے لئے بھی تھا۔

تجزیہ' سید احمد کی زبانی:

سید احمد کوئی بڑے صاحب تصنیف نہ تھے' صرف ان کی ایک ہی تصنیف بتائی جاتی ہے' وہ ''صراط مستقیم'' کے نام سے موسوم ہے۔ یہ سید صاحب کے ارشادات و ملفوظات کا مجموعہ ہے۔ سید اسماعیل نے اسے مرتب کیا ہے۔ اس میں آپ فرماتے ہیں:

''جس طرح بارش سے نباتات اور حیوانات اور انسانوں کو بکثرت فوائد پہنچتے ہیں' اسی طرح جہاد سے عام خلائق کو نفع پہنچتا ہے۔ ایک نفع تو وہ ہے جو اہل ایمان' فرمانبردار اور نیکوں اور سرکشوں اور فاسقوں اور منافقوں کو یکساں پہنچتا ہے بلکہ جن و انس' حیوانات و نباتات بھی اس میں یکساں شریک ہوتے ہیں۔ اور ایک یہ کہ بعض خاص خاص جماعتوں اور بعض خاص خاص اشخاص کو ایک طرح کا نفع حاصل ہوتا ہے اور دوسری جماعتوں اور دوسرے اشخاص کو دوسری طرح کا۔ عمومی نفع کی تفصیل یہ ہے کہ تجربہ بتاتا ہے کہ اہل حکومت کے انصاف' اہل معاملات کی دیانتداری' اہل دولت کی سخاوت و فیاضی اور عام لوگوں کی نیک نیتی سے آسمانی برکتیں نازل ہوتی ہیں' وقت پر بارشیں ہوتی ہیں' پیداوار کی بہتات ہوتی ہے' فصلیں اچھی ہوتی ہیں' تجارت کا فروغ ہوتا ہے' سامان تجارت کا چلن اچھا ہوتا ہے' بلائیں ٹلتی ہیں' مالوں میں ترقی اور نمو ہوتا ہے' اہل ہنر اور ارباب کمال بہت کثرت سے پیدا ہوتے ہیں۔ دین حق کی قوت و شوکت دیندار سلاطین کے عروج اور اطراف ممالک میں ان کی حکومت کی ترقی ملت حقہ کے عساکر و افواج کی قوت اور احکام شرعیہ کی اشاعت و عمومیت سے بدرجہا زیادہ نتائج و برکات ظاہر ہوتی ہیں۔ آسمانی برکتوں کے نزول کے سلسلے میں روم اور ترکی سے ہندوستان کا مقابلہ کر کے دیکھ لو۔ بلکہ موجودہ ہندوستان جس کا بڑا حصہ ''دارالحرب'' بن چکا ہے' اس کا مقابلہ دو سو' تین سو برس پہلے کے ہندوستان سے کرو' آسمانی برکتوں کا کیا حال تھا اور اولیائے عظام اور علمائے کرام کی کتنی بڑی تعداد پائی جاتی تھی۔''

سید احمد نے ''صراط مستقیم'' میں جہاد کے متعلق تفصیلی گفتگو کی ہے۔ اوپر جو اقتباس دیا گیا ہے اس سے بھی پتا چلتا ہے کہ سید احمد کو اپنے گردوپیش کے مسلمانوں کی بے چینی اور اضطراب کا بھی پورا پورا علم اور احساس تھا۔ جب وہ جہاد کے فوائد گنواتے ہوئے انصاف کے حصول میں آسانیوں تجارت میں ترقی اور پیداوار کی بہتات کا ذکر کرتے ہیں تو

وہ عامۃ الناس کو یہ کہہ رہے ہوتے ہیں کہ اس وقت جو یہ تمام تکالیف ہیں، وہ جہاد کے بعد دور ہو جائیں گی یعنی ایک ایسی حکومت قائم ہو گی اور ایک ایسا طبقہ مقتدر ہو گا جو عوام کی تمام پریشانیوں کو دور کرنے کے قابل ہو گا۔ اپنی اس کتاب میں سید احمد نے اہل علم اور دینی طبقوں سے بھی اپیل کی ہے اور ان کو بھی جہاد میں شرکت کرنے کے فوائد سے آگاہ کیا ہے۔ اس لحاظ سے یہ کتاب بہت ہی اہم ہے۔ جس طرح اس تحریک کے بانی اور فکری استاد شاہ ولی اللہ نے اپنے وقت کے مسائل پر لکھتے ہوئے ایک ایک طبقے کو الگ الگ خطاب کیا تھا اور اس کی خرابیاں گنوائی تھیں، بالکل اسی انداز میں ان کی تیسری پشت میں مختلف طبقات کو خطاب کر کے یہ کہا گیا کہ جہاد کرو، اس سے یہ تمام روگ دور ہو جائیں گے، مصائب کے تمام بادل چھٹ جائیں گے۔ چنانچہ سید احمد فرماتے ہیں:

''جہاں تک خصوصی فوائد کا تعلق ہے، جہاد میں شہدائے مومنین، مسلمان مجاہدین، صاحب اقتدار سلاطین اور میدان کارزار کے جواں مردوں کو جو فوائد پہنچتے ہیں، ان کی تفصیل کی ضرورت نہیں۔ ان کے علاوہ ارباب وطن کو تھوڑے تھوڑے وقت میں بڑی بڑی ترقیاں حاصل ہوتی ہیں اور معمولی ریاضتوں سے تحریک ولایت اور مناصب وجاہت پر فائزہ ہوتے ہیں، علوم حقہ کی عام اشاعت ہوتی ہے۔ معلمین وطلباء کی کثرت ہوتی ہے۔ علماء احتساب وقضا اور اجتہاد وافتاء کے عہدوں پر فائز اور امامت باطنی کے منصب سے سرفراز ہوتے ہیں یعنی دین حق کی طرف کھلی ہوئی عمومی دعوت اور عقائد حق اور احکام شریعت کی اشاعت اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے ذریعے انبیاء علیہم السلام کی نیابت کا شرف حاصل ہوتا ہے۔ عام اہل اصلاح بھی اس کے برکات سے محروم نہیں رہتے۔ نیکوکاری اور خدا ترسی کا شوق ترقی کر جاتا ہے۔ اس لئے نیکوکار انسانوں کو اعزاز ہوتا ہے۔ بداخلاق تاجر انسانوں کی تذلیل کا زمانہ ہوتا ہے۔ مستحسن اور شرع باتوں کا فروغ ہوتا ہے، مذموم اور ممنوع امور کا عام زوال ہوتا ہے، مسلمان سلاطین کی اطاعت اور علمائے کرام کی عزت اور اولیائے عظام کی عقیدت اور مسلمانوں کے سواد اعظم میں شمولیت کی برکت سے ان کی طاعات کا ثواب بڑھ جاتا ہے۔''

عوامی فوائد کیا حاصل ہوں گے:

عام مسلمانوں کے فوائد کے بارے میں کہتے ہیں:

''عام مسلمان بھی جہاد سے پیدا ہونے والی برکتوں سے محروم نہیں رہتے۔ معاملات میں درستی، نیت اور اطاعت کی طرف عام رغبت اور شوق دلوں میں پیدا ہو جاتا ہے جس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ دین کے انوار ہر طرف پھیلے ہوتے ہیں، اللہ تعالی کے خاص الطاف وعنایات کا زمانہ ہوتا ہے۔ شرعی رسوم وعادات کا ایسا چرچا ہوتا ہے اور ایسا رواج شروع ہوتا ہے کہ لوگ خود بخود ان کے پابند ہو جاتے ہیں۔ آسمانی برکتوں کے نزول، سلاطین کے انصاف اور اہل سخاوت کی فیاضی کی وجہ سے فارغ البالی اور خوشحالی عام ہوتی ہے اور قوانین شرعیہ کی پابندی کی وجہ سے دنیوی واُخروی امور ومعاملات درست اور باقاعدہ ہو جاتے ہیں۔ اور تو اور فساق اور فجار بھی اس کی برکات سے محروم نہیں رہتے۔ ملت حقہ کے انوار بنی آدم کے قلب میں اس طرح جاری وساری ہو جاتے ہیں اور ملت حق کی شہرت کی وجہ سے مذموم افعال کی قباحت عوام کے دماغوں میں اس طرح راسخ اور جاگزیں

> جس طرح شاہ ولی اللہ نے اپنے وقت کے مسائل پر لکھتے ہوئے ایک ایک طبقے کو الگ الگ خطاب کیا تھا، بالکل اُسی انداز میں اُن کی تیسری پشت میں مختلف طبقوں کو سید احمد نے خطاب کیا۔

ہو جاتی ہے اور منکرات وبدعات کی قباحت ایسی مشہور ومسلم ہوتی ہے کہ حدود وتعزیرات کے خوف یا ہم چشموں اور ہم سروں کے طعن وملامت کے اندیشے اور بدنامی کے خطرے سے فساق وفجار منکرات وبدعات کے اظہار سے دست کش ہو جاتے ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ اہل نفاق بھی اس کی برکات سے محروم نہیں رہتے، وہ قتل کے خوف سے یا اہل ایمان کے دبدبے اور غلبے اور سرکشوں کی ذلت ونکبت کو دیکھ کر ظاہری طور پر دین حق پر قائم رہتے ہیں اور کھلے ہوئے کافروں کے زمرے میں شامل نہیں ہوتے۔ نیز دین کی روشنی پھیل جانے اور آسمانی برکتوں کے نزول اور مسلمانوں کی عظمت وشوکت دیکھ کر اولیائے عظام اور علمائے کرام کے ساتھ خلاط اور رہنے سہنے کی وجہ سے اور ان کے انوار کا ان کے قلوب پر عکس اور ان کے مواعظ کا ان کے دلوں پر اثر پڑنے سے اس کی بھی اُمید کی جاتی ہے کہ دین کا نور ان کے دلوں کی گہرائی میں اتر جائے گا۔''

ذمیوں کی حالت:

ایک عام اضطراب اور ایک ایسا اضطراب جس میں مسلمانوں کے ساتھ ساتھ دوسرے مذاہب کے نام لیوا بھی پھنسے ہوں، ایک ایسی بے چینی جس کا ہندو اور مسلمان دونوں شکار ہوں، ان کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ اس اضطراب اور بے چینی کا علاج جب کیا جائے تو خواہ وہ ایک مذہب کے نام لیوا ہی کیوں نہ ہوں، ان کو دوسرے مذاہب والوں کو بہر حال تشفی ضرور دینی ہو گی کہ اگر ہم کامیاب ہو جائیں گے تو اس سے تمہارے اضطراب، بے چینی اور دکھوں کا بھی مداوا ہو جائے گا۔ اس تشفی کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ وہ عملی طور پر نہ بھی ہوں لیکن ان ہمدردیوں سے دوسروں کی کوششوں اور جہاد کا موید ہو جاتا ہے اور وہ دشمن کے ساتھ ملنے سے انکار کر دیتا ہے۔ چنانچہ اسی صورت حال کے تحت سید احمد نے ذمی کافروں کو بھی خطاب کیا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس خطاب سے یہ ذمی کافر مطمئن نہ ہوں یا وہ اس صورت حال ہی کو اب قبول کرنے کے لئے تیار نہ ہوں لیکن اس سے ایک امر واضح ہو جاتا ہے کہ اس تحریک جہاد کے قائدین کی نگاہوں سے یہ پہلو اوجھل نہیں تھا۔ سید احمد ذمی کافروں سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''ذمی کافر بھی جو مسلمانوں کی رعیت بن کر رہیں اور جزیہ دیں، اس جہاد کی برکات سے محروم نہیں رہتے۔ آسمانی برکتوں، تجارت کے فروغ، بادشاہوں کے انصاف، راہزنوں سے امن واطمینان کی وجہ سے وہ اسلامی ممالک میں فارغ البال اور خوش حال رہتے ہیں۔ اہل حق کے ساتھ رہنے سہنے اور شہری زندگی گزارنے اور ان کی رسوم وعادات کے رواج وشہرت کی وجہ سے نیز دین حق کے ماننے والوں کے اتباع شریعت کی وجہ سے معاشی اور انفرادی امور ومعاملات کی درستی اور باقاعدگی دیکھ دیکھ کر وہ متاثر ہوتے ہیں اور اس کی اُمید کی جاسکتی ہے کہ ان کے دل میں دین حق کا میلان ہو جائے گا۔''

''قصہ مختصر یہ ہے کہ اہل ایمان پر جہاد کا وجوب اور قیامت تک اس کو قائم رکھنے کے حکم کا زمانہ شروع میں تو یہی حیثیت رکھتا ہے جو بارش کے نازل کرنے اور نہروں کے جاری کرنے کی حیثیت کا زمانہ تکوین میں ہے۔ باقی چند ایسے اشخاص کی ہلاکت جو اپنی استعداد کھو چکے ہیں، مثلاً بعض مسلمان جو جہاد کی راہ میں رکاوٹ بنتے ہیں اور اپنی باطنی خرابی، حسد اور کفار سے محبت کی بنا پر مجاہدین کی مخالفت اختیار کرتے ہیں اور ہلاکت ابدی میں اپنے آپ کو مبتلا کرتے ہیں اور بدترین منافقین کے زمرے میں داخل ہوتے ہیں، تو ان لوگوں کی ہلاکت وبربادی جہاد کے عمومی منافع میں مخل نہیں، اس لئے کہ یہی بارش ہے جس کا نفع عام انسانوں کے حق میں بدیہی ہے، گو بعض آدمی عمارتوں کے انہدام یا سیلاب اور نہروں کی طغیانی سے تلف ہو جاتے ہیں لیکن اس کے باوجود بارش کی برکت اور نفع میں کلام نہیں۔''

سید احمد کا جہاد کے بارے میں جو موقف ہے' اس سے پتا چلتا ہے کہ اُس زمانے میں اضطراب اور بے چینی کس درجے کو پہنچی ہوئی تھی۔ یہی وہ حالات تھے جنہوں نے سید احمد کو جلد سے جلد اس تحریک کے احیاء پر مجبور کیا۔ حج سے جب واپس آئے تو بریلی میں قیام کیا۔ اس قیام اور ہجرت کرنے کے درمیان ایک سال دس ماہ کا عرصہ لگا۔ اس عرصے میں پوری توجہ اس جہاد کی تحریک کے مختلف پہلوؤں کو منظم کرنے میں لگی اور ساتھ ساتھ اپنے آبائی شہر میں مساجد اور مرمت طلب مکانوں کی تعمیر میں منہمک رہے۔ دراصل ایک سال دس ماہ کا یہ عرصہ سید صاحب کی زندگی میں بہت ہی اہمیت رکھتا ہے۔ کیونکہ اس دور میں ایک طرف روزمرہ کی زندگی وہی عبادت و ریاضت' وہی نوافل' وہی دعوت و تبلیغ اور وہی رشد و ہدایت کا سلسلہ تھا' لیکن دوسری طرف ایک نئی زندگی لے کر اپنے رفقاء کو بھی تیار کرنا ضروری تھا۔ چنانچہ اس زمانہ میں سید صاحب خود بہت زیادہ جفاکش اور جسمانی محنت سے وابستہ رہے۔ اس سے تمام ساتھیوں اور عقیدت مندوں میں بھی اس سپاہیانہ اور محنت و مشقت کی زندگی سے زیادہ سے زیادہ دلچسپی پیدا ہونی شروع ہوگئی۔

بالآخر سید احمد اپنے تمام رفقاء کو لے کر 17 جنوری 1826ء کی ایک صبح اپنے آبائی وطن سے نکل کھڑے ہوئے۔ یہ صبح بھی عام صبحوں جیسی تھی۔ اس صبح کو سورج اسی طرح نکلا تھا۔ اس دن بھی عام دنوں کی طرح مؤذن نے اذان دی تھی۔ لیکن اس کے باوجود آج مؤذن کی اذان میں تاثر مختلف تھا' پیغام کی شدت مختلف تھی اس لئے کہ اس صبح کو رائے بریلی کا رہنے والا یہ عالم باعمل اپنے رفقاء کو لے کر ایک ایسی سمت جا رہا تھا جہاں سے واپسی ممکن نہ تھی۔ ایک ایسی منزل کا مسافر بننے کا اس نے اعلان کیا تھا جس منزل کا کوئی خاتمہ نہ تھا۔ سید احمد اور ان کے رفقاء نے ہندوستان کی شمال مغربی سرحد پر پہنچنے کے لئے جو راستہ اختیار کیا تھا وہ بذات خود اتنا کٹھن اور جان لیوا تھا کہ اس پر چلنا اور اس کو طے کرنا بھی ایک عظیم جہاد تھا۔

سرحد ہی کا انتخاب کیوں؟

اس کا ذکر خود سید صاحب کی زبانی سنیئے:

''میں نے ہندوستان میں خیال کیا کہ کوئی جگہ ایسی ماموں ہو کہ وہاں مسلمانوں کو لے کر جاؤں اور جہاد کی تدبیر کروں باوجود اس وسعت کے کہ صدہا کوس میں ملک ہندوستان واقع ہوا ہے' کوئی جگہ ہجرت کے لائق خیال میں نہ آئی۔ کتنے لوگوں نے صلاح دی کہ اسی ملک میں جہاد کرو' جو کچھ مال' خزانہ' اسلحہ وغیرہ درکار ہو ہم دیں گے۔ مگر مجھ کو منظور نہ ہوا۔ اس لئے کہ جہاد سنت کے موافق چاہئے۔ بلوہ کرنا منظور نہیں۔ تمہارے ملک کے ولایتی بھائی بھی حاضر تھے۔ انہوں نے کہا ہمارا ملک اس کے واسطے بہت خوب ہے۔ اگر وہاں چل کر کسی ملک میں قیام اختیار کریں تو وہاں کے لاکھوں مسلمان جان و مال سے آپ کے شریک ہو جائیں گے۔ خصوصاً اس سبب سے کہ رنجیت سنگھ والی لاہور نے وہاں کے مسلمانوں کو حد درجے تنگ کر رکھا تھا۔ طرح طرح کی ایذا پہنچاتا ہے اور مسلمانوں کی بے آبروئی کرتا ہے۔ جب اس کی فوج کے لوگ اس ملک میں آتے ہیں' مسجدوں کو جلا دیتے ہیں' کھیتیاں تباہ کر دیتے ہیں' مال و اسباب لوٹ لیتے ہیں' بلکہ عورتوں اور بچوں کو پکڑ لے جاتے ہیں اور اپنے ملک پنجاب میں لے جا کر بیچ ڈالتے ہیں۔ پنجاب میں وہ مسلمانوں کو اذان بھی نہیں کہنے دیتے۔ مسجدوں میں گھوڑے باندھتے ہیں۔ گاؤکشی کا تو کیا ذکر' جہاں سنتے ہیں کہ کسی مسلمان نے گائے ذبح کی ہے' اس کو جان سے مار ڈالتے ہیں۔ یہ سن کر میرے خیال میں آیا کہ یہ سچ کہتے ہیں اور یہی مناسب ہے کہ ہندوستان سے ہجرت کر کے وہیں چل کر ٹھہریں اور سب مسلمانوں کو متفق کر کے کفار سے جہاد کریں اور ان کے ظلم و ستم سے مسلمانوں کو چھڑائیں۔''

یہ تقریر سید احمد نے ریاست سوات کی سرحد پر واقع گاؤں پنجتارے میں سرحد کے خوانین اور ان کی تحریک میں شریک مجاہدین کے روبرو کی تھی۔ اس تقریر کی اہمیت یہ ہے کہ اس میں سید احمد نے اپنی زبان سے صوبہ سرحد آنے کی وجوہات بیان کر دی ہیں اور انہی وجوہات کی روشنی میں یہ طے کرنا بہت آسان ہو جاتا ہے کہ انہوں نے اس علاقے کو جہاد کے لئے کیوں منتخب کیا۔ اب اس علاقے کے انتخاب اور سب سے پہلے سکھوں سے جہاد کے اعلان نے سید احمد کی تحریک جہاد کو بہت دنوں تک متنازعہ فیہ مسئلہ بنائے رکھا اور ایک حد تک اب بھی ہے۔

> کتنے لوگوں نے صلاح دی کہ اِسی ملک میں جہاد کرو۔ جو کچھ مال' خزانہ' اسلحہ وغیرہ درکار ہو' ہم دیں گے' مگر مجھ کو منظور نہ ہوا' کیونکہ.....

پرانی تحریکوں پر کام کی ابتدا خود بعض تحریکوں کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اس تحریک جہاد پر زیادہ کام آج سے ستر' اسی برس پہلے شروع ہوا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مسلمانوں کی اپنی سیاسی جدوجہد ایک نئے موڑ میں داخل ہو رہی تھی اور اس میں انگریزی پڑھا لکھا طبقہ قیادت سنبھال رہا تھا اور علماء کا طبقہ پیچھے ہٹ رہا تھا' تو اس وقت سید احمد کی تحریک کو کھنگالا گیا اور نوجوانوں کے سامنے اس تحریک کو سب سے پہلے انگریز کی مخالف اور سامراج دشمن تحریک کے طور پر پیش کیا گیا اور علماء کی تحریک آزادی کو اس تحریک کا حصہ ظاہر کیا گیا۔ یہ باتیں بہت حد تک درست تھیں۔ تاریخی لحاظ سے اُن میں کوئی الجھاؤ نہ تھا لیکن جب کسی تحریک کو ایک خاص وقت میں کھنگالا جاتا ہے اور اسے عوام کے سامنے پیش کیا جاتا ہے تو اس تحریک کے انہی پہلوؤں پر زور دیا جاتا ہے جن کی اس زمانے میں ضرورت ہوتی ہے اور اس کو مقبول بنانے اور ان کے اردگرد عظیم روایات کا تانا بانا بننے کے کام آتی ہیں۔ اس لئے جب 1930ء کے بعد ان تحریکوں پر تحقیقی کام شروع ہوا' اس وقت ضرورت اس امر کی تھی کہ ہم برطانوی سامراج کے خلاف اپنی نفرت کا اظہار کر سکیں اور ان طبقوں پر لعن طعن کے ڈونگرے برسا سکیں جو برطانوی سامراج کی براہ راست یا بالواسطہ حمایت میں مصروف تھے اور جو علماء برطانوی استبداد کے خلاف سینہ سپر تھے' ان کو اور ان کی تحریک کو اس تحریک جہاد کا صحیح وارث ثابت کیا جائے۔ ویسے وہ بہت حد تک اس تحریک کے وارث بھی تھے اور اس تحریک میں ایک تسلسل بھی رہا ہے۔

صوبہ سرحد کا انتخاب:

اس تحریک کے ان تمام پہلوؤں پر اور اب تک متعدد علماء اور مؤرخ اتنا کام کر چکے ہیں کہ اب ان سے نتائج اخذ کرنا اور ان پر حکم لگانا کوئی زیادہ مشکل کام نہیں رہا ہے۔ لیکن اس کے باوجود ایسی تحریکوں کے سلسلے میں جو مشکل درپیش رہی ہے' وہ ہے اس کا تقدس۔ عام طور پر ایسی تحریکوں کی داستان بیان کرنے والے یا تو معتقدین کی صف میں کھڑے ہوئے ہیں اور یا پھر مخالفین کی صف میں۔ دونوں طرح سے تحریک کے مثبت اور منفی پہلو بہ یک وقت اجاگر نہیں ہو پاتے۔ سید احمد اور ان کے رفقاء نے ہجرت اور جہاد کے لئے سرحد کا علاقہ جن مقاصد کے لئے منتخب کیا' ان میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے۔

> سید احمد شہید کی ''تحریک جہاد'' پر تبصرہ جاری ہے۔ باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ کیجئے۔

محمد عدنان ہارون

بیرون پاکستان میں پاکستانی صہیونی

* نوائے وقت کے 19 ستمبر کے شمارے میں ''اوورسیز پاکستانی ایڈیشن'' میں تارکین وطن کی مینڈکیوں کو بھی زکام ہوا ہے اور 56 سال کے بعد اچانک ان افلاطونوں کو بھی منطق آ گئی ہے۔ اس ایڈیشن کی سب سے بڑی سرخی میں تارکین پاکستان نے یہ منطقی سوال کیا ہے:

''ہم نے اکثر عیسائی ممالک کو تسلیم کر رکھا ہے یہودی ملک کو کیوں نہیں کیا؟''

یہ استفسار کسی بچے یا کسی غیر مسلم کی زبان پہ آتا تو اور بات تھی مگر مسلم امت کے بالغ العقل حضرات کی طرف سے یہ سوال عکاسی کرتا ہے اس غلامانہ ذہنیت کی جسکی وجہ سے ہماری پستی کی کوئی آخری حد نظر نہیں آتی۔

اسرائیل کو قبول کرنے کی پہلی دلیل یہ دی گئی ہے کہ:

''اسرائیل کو تسلیم نہ کر کے ہمیں کیا فوائد حاصل ہوئے..... اور بھارت ہمارے فیصلوں سے فائدے اٹھا رہا ہے۔''

یہ وہی سبق ہے جو ہمیں طالبان کے حوالے سے پڑھایا گیا تھا۔ پاکستان ان چند ملکوں میں سے تھا جنہوں نے طالبان کو قبول کیا تھا۔ اس وقت منطق یہ تھی کہ ساری دنیا نے تو ان سے تہی دامن کیا ہوا ہے تو ہمیں قبول کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ چنانچہ ہم نے آناً فاناً یوٹرن لیا اور نہ صرف یہ کہ طالبان سے ناطہ توڑا بلکہ ان کے ذبیحہ سے اپنے ہاتھ رنگے۔ اسی طرح 11 ستمبر کے بعد کہا گیا تھا کہ اگر ہم نے ''دہشت گردی کی جنگ'' میں امریکہ کا ساتھ نہ دیا تو بھارت اس کا بھرپور فائدہ اٹھائے گا۔ لہٰذا ہم نے امریکہ کا ساتھ دیا۔ اس کے بعد جو سلوک ہمارے ساتھ اب تک ہوا ہے' وہ ایک المناک داستان ہے: ہماری ایک سرحد، جو طالبان دور تک ہمیشہ سے محفوظ رہی تھی، اب ہم پر اس طرف سے حملے ہو رہے ہیں۔ امریکہ کے نئے ''جمہوری'' افغانستان میں ہمارے سفارتخانوں پر حملے اور ہمارے پرچم جلائے جا رہے ہیں۔ بھارت پوری طرح افغانستان میں متحرک و فعال ہے جس کا خمیازہ بہت جلد ہمیں بھگتنا پڑے گا۔ امریکہ کے شکاری کتے ہمارے ملک میں دندناتے پھر رہے ہیں اور ہماری ایئر بیسز پر امریکہ کا قبضہ ہے۔ اس مسلمان کشی اور امریکہ نوازی کا بدلہ یہ ہونا چاہیے تھا کہ امریکہ ہمیں Most Favoured Nation کا درجہ دیتا اور پاکستان میں امریکی سرمایہ کاری کا سیلاب آ جاتا' مگر الٹا ہمیں بھارت کو MFN کا مقام دینا پڑا۔ کشمیر کہ جسکو میاں مشرف نے ایشو نمبر ون قرار دیا تھا وہ جس طرح سے اسوقت سرد خانے میں پڑا ہے پہلے کبھی نہ تھا۔ چنانچہ اس پورے ماحول کا اگر فائدہ ہوا ہے تو بھارت کو ہوا ہے اور یہ نتیجہ ہے امریکہ اور ابن الوقتوں کی منطق کا۔

پھر ایک نکتہ یہ بھی ہے کہ پاکستان تو ''دہشت گردی'' کے خلاف جنگ میں امریکہ کی فرنٹ لائن سٹیٹ ہے، لہٰذا ہم ایک دہشت گرد ملک یعنی اسرائیل کو کیسے تسلیم کر لیں؟ ہمیں تو دہشت گردی ختم کرنی ہے جبکہ اسرائیل سب سے بڑا دہشت گرد ہے۔ مغربی افریقہ کے شہر دربن میں ہونے والی کانفرنس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسرائیل کی دہشت گردی کی اب دنیا قائل ہو چکی ہے۔

جہاں تک بھارت کا ہمارے ''جذباتی'' فیصلوں سے فائدہ اٹھانے کا تعلق ہے تو اس میں ہمارے جذبات سے نہیں بلکہ ہماری حکمت سے عاری حکمت عملی، دانش سے بے بہرہ دانشمندی' کم ہمتی' بزدلی' منافقت اور انانیت کا پیش خیمہ ہے۔ ہم خارجہ پالیسی کے معاملے میں نہایت احمق واقع ہوئے ہیں جس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اکثر و بیشتر ہمارے ملک پر غاصب جرنیلوں کا قبضہ رہا ہے جن کی ہر خارجہ پالیسی ہمیشہ خارجہ پالیسی ثابت ہوئی ہے۔

مزید یہ کہ اگر بھارت کے بار بار پاکستان کو بدنام کرنے کے عمل سے ہی بچنا ہے تو پھر کشمیر کے حق سے بھی دست بردار ہو جائیں۔ آخر کشمیر میں دراندازی کا حوالہ دے کر بھارت ہر روز ہمیں بدنام کرتا رہتا ہے۔ اصل میں فلسطین اور کشمیر کے معاملات کو الگ الگ سانچوں میں نہیں تولا جا سکتا۔ ان دونوں میں بہت مماثلت ہے۔ دونوں پر مسلمانوں کا قانونی و اخلاقی حق ہے۔ اگر آپ ایک حق سے دست بردار ہوتے ہیں تو دوسرے پر کس منطق کے تحت حق مانگیں گے؟

اب آیئے اصل وجہ کی طرف کہ پاکستان نے اسرائیل کو کیوں قبول نہیں کیا؟ پاکستان اصلاً ایک نظریاتی ریاست ہے جو کہ اسلام کے نام پر بنا' جس کا تقاضا ہے کہ جہاں کہیں بھی مسلمانوں کے خلاف کوئی ظلم ہو پاکستان اس کے خلاف آواز اٹھائے۔ اس ضمن میں پچھلے 56 سالوں میں دو خطوں میں مسلمانوں کا مسلسل قتل و غارت ہو رہا ہے: ایک کشمیر اور دوسرے فلسطین۔

فلسطین کے ضمن میں یہودیوں نے دعویٰ کیا کہ کیونکہ ان کے آباء و اجداد فلسطین کی سرزمین میں صدیوں پہلے آباد تھے لہٰذا ان کو فلسطین میں آباد ہونے کی اجازت دی جائے۔ چنانچہ اہل یورپ نے اپنی مصلحت کی خاطر یہ حق یہودیوں کو دے دیا۔ 1948ء میں اسرائیلی ریاست قائم ہو گئی اور اسکے بعد سے اب تک یہودیوں نے ہزاروں کی تعداد میں فلسطینی مسلمانوں کا قتل اور لاکھوں کو بے گھر کیا ہے۔ یہ ایک نسلی اور ریاستی دہشت گردی تھی۔ چنانچہ جیسا کہ ہونا چاہئے تھا عربوں اور دیگر مسلمان ممالک بشمول پاکستان کے سب نے اسرائیلی ریاست کو قبول کرنے سے انکار کیا اور عربوں نے تو کئی دفعہ اس ناجائز ریاست کو ختم کرنے کے لئے جنگ بھی کی۔ مگر امریکہ کی پشت پناہی کی وجہ سے اسرائیل قائم رہا۔ اگرچہ اسرائیل کو فوری خطرہ تو ہمیشہ عرب ممالک سے رہا ہے چنانچہ آپس کے انتشار اور سخت امریکی دباؤ کی وجہ سے بہت سے عرب ممالک نے مجبوراً اسرائیل کو تسلیم کر لیا۔ گویا یہ ''خوئے تسلیم'' ان پر ٹھونسی گئی تھی اور ان کی اپنی مرضی کے مطابق نہ تھی۔ دوسری طرف کیونکہ پاکستان اسرائیل کے لئے فوری اور براہ راست خطرہ نہیں تھا لہٰذا پاکستان پر دباؤ کبھی بھی بہت شدید نہیں رہا۔ اب پاکستان کے ایٹمی طاقت بننے کے بعد پاکستان غیر مسلموں کے لئے عموماً اور اسرائیل کیلئے خصوصاً بہت بڑا خطرہ بن چکا ہے اور اسرائیل کو یہ غم کھائے جا رہا ہے کہ اگر پاکستان کی ایٹمی طاقت کسی عرب ملک کو منتقل ہو گئی یا پھر کسی حقیقی پاکستانی مومن کے ہاتھ میں پاکستان کی باگ دوڑ آ گئی تو کیا ہوگا۔

اور اگر یہودیوں کی آباء و اجداد والی منطق کے تحت اسرائیل کو قبول کر لیا جائے تو پھر کل کو ہندو یہ مطالبہ کر سکتا ہے کہ ارض پاکستان میں ہمارے آباء و اجداد صدیوں آباد رہے چنانچہ انہیں یہ خطہ واپس ملنا چاہئے۔ اگر ایسا ہوا تو اس وقت ہمارے بھولے تارکین وطن کیا جواب دیں گے؟

تارکین وطن میں سے جن لوگوں کے بیان نقل گئے ہیں ان میں سے چند حضرات شعبہ قانون سے تعلق رکھتے ہیں۔ میں حیران ہوں کہ قانون جاننے والے بھی اسرائیل کو تسلیم کرنے کی بات کر رہے ہیں۔ ذرا بین الاقوامی قوانین خاص طور پر اقوام متحدہ کے قوانین کی رو سے بتایئے کہ یہودیوں کا فلسطین پر حق ایک قانونی عمل تھا یا غصب حق قانون کا بدترین واقعہ؟ اور بین الاقوامی قوانین کی جو خلاف ورزی اسرائیل ہر دوسرے دن ممنوعہ فلسطینی علاقوں میں دراندازی کر کے کرتا ہے وہ کونسے قانون کے مطابق ہے؟

امریکی قانون کے ان محافظوں میں سے کچھ نے ''مذہبی ٹھیکیداروں'' پر رکیک حملے کرنے کے بعد خود مذہبی ٹھیکیداری کا فریضہ سرانجام دیتے ہوئے اسرائیل کے حق میں قرآن وسنت سے کچھ دلائل گھڑنے کی ناپاک کوشش کی ہے۔ چنانچہ ان میں سے ایک ''معروف قانون دان اور سکالر'' نے ارشاد فرمایا ہے کہ:

''مذہبی رہنما قرآن کی اس آیت پر زور دیتے ہیں کہ قرآن مجید میں لکھا ہے کہ یہود ونصاریٰ مسلمانوں کے دوست نہیں ہوسکتے۔ اس کا انکار کرنا ممکن نہیں کیونکہ یہ سچائی اور صداقت پر مبنی ہے۔''

قرآن کی ''سچائی اور صداقت'' کا اقرار کرنے کے بعد یہ صاحب خود ہی اس سوال سے قرآنی سچائی وصداقت کی نفی کرتے ہیں:

''میں نام نہاد مذہبی ٹھیکیداروں سے پوچھتا ہوں کہ نصاریٰ کو تو ہم نے تسلیم کر رکھا ہے..... صرف یہودیوں کو تسلیم کیوں نہیں کیا جاسکتا؟''

اس اعتراض کا ایک جواب تو اوپر دیا جاچکا ہے۔ اس کے علاوہ کچھ اور دلائل بھی سن لیجئے: اول تو یہ کہ جو جارحیت اسرائیل نے فلسطینیوں کے ساتھ کی ہے وہ قدرے مختلف ہے ان تمام جارحیتوں سے جو کسی بھی مسلمان ملک کے خلاف عیسائیوں نے کی۔ پھر جب عیسائی ممالک ہم پر قابض تھے تو اس وقت تو ان کو سیاسی سطح پر قبول یا نہ قبول کرنے کا سوال ہی نہیں تھا اور جب عیسائی ممالک مسلمان ممالک کو آزاد کر گئے تو ان سے آدھا جھگڑا تو ویسے ہی ختم ہو گیا۔ اس ضمن میں پاکستان کا معاملہ دوسرے اسلامی ممالک کی نسبت منفرد ہے کیونکہ جب پاکستان وجود میں آیا تو وہ ایک نئی نویلی دلہن کی مانند تھا جو اس امر کا طالب تھا کہ دنیا اس کو اپنے خاندان میں قبول کرے نہ کہ وہ پہلے سے موجود شدہ ممالک کو قبول کرتا پھرتا!! مگر جب اسرائیل وجود میں آیا تو پاکستان پہلے سے موجود تھا اور اب پاکستان کو فیصلہ کرنا تھا آیا اسے تسلیم کرے یا نہ کرے؟

یہود ونصاریٰ سے بغل گیر ہونے کیلئے سیرت نبویؐ سے یہ مثال بھی دی گئی ہے کہ:

''حضورؐ نے مدینہ میں یہودیوں سے معاہدہ کیا۔''

یہاں بھی اوپر دی گئی دلیل ہی کفایت کرے گی۔ یعنی یہ معاہدہ (جو کہ میثاق مدینہ کہلاتا ہے) حضورؐ نے اس وقت کیا جب آپؐ ابھی مدینہ پہنچے ہی تھے اور ان کی حکومت وہاں پر عہد طفولیت میں تھی اور اسلحہ سے لیس تین یہودی قبائل کے مقابلے میں بہت کمزور تھی۔ چنانچہ ایک طرف تو ضرورت تھی کہ حضورؐ کی نئی حکومت کو قبول کیا جائے اور دوسری طرف کوئی ایسا عمل کیا جائے کہ فی الوقت یہودی قبائل رام ہو جائیں اور کوئی فوری جارحیت بروئے کار نہ لاسکیں۔ یہ کام حضورؐ نے یہودیوں سے معاہدہ کر کے انجام دیا۔ اس سے یہ فائدہ بھی ہوا کہ مدینہ کی ایک سرحد محفوظ ہو گئی اور حضورؐ کو پورا موقع مل گیا کہ اپنی پوری توجہ قریش کو قابو کرنے میں صرف کرسکیں۔

جو لوگ میثاق مدینہ کو یہودیوں اور عیسائیوں سے بغل گیر ہونے کے لئے استعمال کرتے ہیں وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ میثاق مدینہ کی دھجیاں بھی یہود نے ہی اڑائی تھیں۔ انہوں نے مسلسل معاہدہ کی خلاف ورزی کی اور مسلمانوں کے خلاف سازشوں میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی اور یہی وجہ تھی کہ نبیؐ نے بنی قریظہ کے یہودی قبیلے کے سات سو آدمیوں کو بیک وقت قتل کروایا تھا۔ اسکے باوجود بھی یہ لوگ باز نہ آئے اور ان ہی کی کوششوں سے عرب کی سب سے بڑی فوج مدینہ کے اوپر چڑھ آئی اور غزوہ احزاب کا معرکہ پیش آیا۔ یہ ساری مہم جوئی مظہر ہے اس قرآنی آیت کا:

''تم اہل ایمان کی عداوت میں سب سے زیادہ سخت یہود اور مشرکین کو پاؤ گے۔'' (القرآن 5:82)

باقی رہی یہ بات کہ یہودیوں سے روابط رکھ کر ہمیں بہت فائدہ ہو جائے گا تو اس کی مثال ترکی ہے۔ ترکی نے اسرائیل کو تسلیم کیا ہوا ہے مگر اس کے باوجود اسرائیل ترکی کی سب سے بڑی سیاسی خواہش یعنی یورپی یونین میں داخلہ کے ضمن میں کوئی مدد نہ کرسکا۔

جہاں تک اس دلیل کا تعلق ہے کہ اسرائیل کو تسلیم کر کے روڈ میپ پر پیش رفت ہو سکے گی تو یہ دلیل بھی بے معنی ہے۔ کیونکہ امریکہ کی ہمیشہ کوشش رہی ہے کہ فلسطین کا تنازعہ کسی نہ کسی طرح حل ہو جائے اور اس معاملے میں سابق صدر کلنٹن نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا کہ کوئی حل نکال کر اپنا نام تاریخ میں اچھے الفاظ میں درج کرالیں مگر ہر دفعہ اسرائیل ہی کی طرف سے خلاف ورزی ہوئی ورنہ یاسر عرفات تو ہمیشہ ''مائل بہ کرم'' رہے ہیں۔ تو جب امریکہ ہی روڈ میپ کے لئے کچھ نہ کرا سکا تو پاکستان کس کھیت کی مولی ہے؟ اور جب پورا عالم اسرائیل کے خلاف قرارداد لاتا ہے اور امریکہ اس کو ویٹو کر دیتا ہے تو ایسی صورت میں پاکستان کیا کرے گا؟ ہماری اتنی ہمت ہے کہ امریکہ کی آنکھ میں آنکھ ڈال سکیں؟ یہ تو بڑی مردانگی کا کام ہے اور ہمارے ''جرنیل'' تو فون کالوں سے ہی شہید ہو جاتے ہیں اگر امریکہ یا اسرائیل نے بندوق نکال لی تو کیا ہوگا؟

اسرائیل کو تسلیم کرنے میں ایک دلیل یہ بھی دی جا رہی ہے کہ کچھ اسلامی ممالک نے اسے تسلیم کیا ہوا ہے اور اگر ہم بھی کرلیں تو ہمارے وارے نیارے ہو جائیں گے۔ واہ صاحب! کیا منطق ہے۔ یعنی اگر باقی ممالک خودکشی کر چکیں ہیں تو ہم بھی کر لیں۔ جن اسلامی ممالک نے اسرائیل کو تسلیم کیا ہے انکا تسلیم کرنا بالمعنی ہے۔ وہ اپنی خارجہ پالیسیوں میں اتنے ہی آزاد ہیں جتنے ہم اور وہاں بھی جمہوریت کی پاسداری اتنی ہی ہے جتنی ہمارے ہاں۔ پھر یہ کہ یہ ممالک بچارے کمزور ہیں اور انکے پاس نہ تو ایٹمی صلاحیت ہے اور نہ وہ اعلیٰ فوج جو پاکستان کے پاس ہے۔ نیز اگر ہمنے اپنے مہرے صحیح کھیلے ہوتے اور افغانستان، چین وایران کو ساتھ ملایا ہوتا تو شطرنج کا مزہ ہی کچھ اور ہوتا۔

تارکین وطن نے مزید یہ بھی کہا ہے کہ:

''ہم کشمیر اور فلسطین کے لئے بہت درد رکھتے ہیں۔''

جی ہاں خوب جان لیا آپ کتنا درد رکھتے ہیں۔ البتہ یہ سارا درد آپ کے پیٹ میں ہے۔ اسی لئے آپ فلسطینیوں کے قاتلوں سے محبت کی پینگیں بڑھانے کی باتیں کر رہے ہیں اور ان ہزاروں بہنوں اور بھائیوں کی شہادت کی نفی کرنا چاہتے ہیں جو کہ اسرائیلی تشدد سے جان کھو چکے ہیں۔ ہماری پستی کا یہ عالم ہے کہ ''ہو گیا مانند آب ارزاں مسلماں کا لہو'' کے مصداق آج کل ویسے ہی مسلم خون کی قیمت گر چکی ہے لہٰذا کوڑیوں کے بھاؤ بھی بک جائے تو بیچ دو۔ ڈالروں کی ٹھنڈی چھاؤں میں پلنے والے اور سود کا غازہ چہرے پہ سجانے والے کیا جانے اس ماں کا درد جسکا کمسن یتیم لخت جگر باپ کے خون کا بدلہ لینے کیلئے سنگ مرمر ہاتھ میں اٹھائے نکلا اور اس سے پہلے کہ اس کا یہ ''بم'' کسی اسرائیلی فوجی کے جوتے کا تسمہ ''نوچی'' کرتا ایک ٹینک نے اس خطرناک دہشت گرد کا سینہ چھلنی کر دیا اور وہ بیچارہ سنگ ہاتھ میں لئے ہی شہید ہو گیا۔ خیر یہ سب تو جذباتی باتیں ہیں جبکہ امریکیوں کی تنخواہوں پر پلنے والے شیوخ کا فتویٰ ہے کہ ہمیں جذبات سے ماوراء ہونا چاہیے۔ یہ بات ٹھیک بھی ہے کیونکہ جذبات تو انسانوں کا خاصہ ہوتے ہیں جبکہ ہم جدید دور کے حیوان تو انسانوں سے افضل ٹھہرے کیونکہ ہم عقلیت پسندی اور زمینی حقائق کے علم جیسی صفات سے بہرہ مند ہیں۔

11 ستمبر کے بعد سے پاکستان کا کردار حضرت عیسیٰ کو ''سولی'' چڑھوانے والے حواری جوڈس (Judas) کا سا رہا ہے۔ مگر حضرت عیسیٰؑ تو سولی نہ چڑھے بلکہ سولی پر جو ڈس ہی چڑھا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ دوسروں کو سولیوں پر لٹکوانے کے چکر میں ہم خود سولی چڑھ جائیں۔

اس پورے معاملے میں تارکین وطن کی صرف ایک بات ہے جس سے میں کامل اتفاق کرتا ہوں اور وہ یہ کہ:

''اس (اسرائیل) کو تسلیم کرنے سے ہماری ناک نہیں کٹے گی''۔

بجا فرمایا ہم گزشتہ تین سالوں میں اتنی دفعہ ناک کٹوا چکے ہیں کہ اب مزید کی گنجائش نہیں! اب کے اگر کچھ کٹا تو ہماری شہ رگ ہی کٹے گی اور بندوق مسلم صیہونیوں کے کاندھے پر ہوگی اور ٹریگر (trigger) یہود وہنود کے ہاتھ میں۔

سادگی اپنوں کی دیکھ.....

مرزا ایوب بیگ

* اردو کے ایک بڑے اخبار کے ممتاز کالم نویس جو 11 ستمبر کے سانحہ کے بعد صدر مشرف کے طالبان کے حوالہ سے یوٹرن لینے کے زبردست سپورٹر ہیں۔ اس سانحہ کی دوسری برسی کے موقع پر انہوں نے اپنے کالم میں اپنے سابقہ مؤقف کا اعادہ کرتے ہوئے دو نکات بڑے زوردار انداز میں ایک بار پھر پیش کئے ہیں اول یہ کہ امریکہ کے مطالبات تسلیم کرنے اور دہشت گردی کے خلاف امریکہ کا اتحادی بننے کا مشرف کا فیصلہ بالکل درست تھا اور مشرف کی جگہ کوئی بھی حکمران ہوتا' یہی فیصلہ کرتا۔ دوسرا کوئی آپشن سرے سے موجود ہی نہیں تھا۔ دوم یہ کہ طالبان نے اسامہ کو امریکہ کے حوالہ نہ کر کے اپنی تباہی کو خود دعوت دی۔ ملا عمر کی حکومت صورتِ حال کا صحیح ادراک نہ کر سکی۔ اس نے ضد اور ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کیا۔ اگر طالبان حکومت اسامہ کو امریکہ کے حوالے کر دیتی تو نہ صرف افغانستان تباہی سے بچ جاتا بلکہ طالبان حکومت بھی محفوظ رہ جاتی۔ حقیقت یہ ہے کہ جب سے ہم طالبان کے خلاف امریکہ کے اتحادی بنے ہیں اور جب طالبان حکومت نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ تباہ ہو جائیں گے' مگر اپنے مہمان کو امریکہ کے حوالے نہیں کریں گے کیونکہ امریکہ نے اسامہ کے خلاف کوئی ثبوت نہیں دیا' اس وقت سے ان دونوں نکات پر بحث جاری ہے۔ موافق اور مخالف دلائل دیئے جا رہے ہیں۔

جہاں تک پہلے نکتے کا تعلق ہے' وقت کے گزرنے کے ساتھ کوئی خاص فرق واقع نہیں ہوا۔ لہٰذا موافقین اور مخالفین دونوں کا حق ہے کہ وہ اپنے اپنے مؤقف پر قائم رہیں لیکن جہاں تک دوسرے نکتے کا تعلق ہے' وقت نے ثابت کر دیا ہے کہ امریکہ شروع ہی سے بدنیت تھا۔ وہ حملہ کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ اسامہ اسے سرے سے مطلوب تھا ہی نہیں۔ اصل مسئلہ اپنے مفادات کے حوالہ سے اس علاقہ پر عسکری تسلط تھا۔ اس کے لئے اس نے عذر لنگ کا سہارا لیا بلکہ اب تو یہ باتیں بھی سامنے آ رہی ہیں اور خود مغرب کا پریس اور دانشور انکشاف کر رہے ہیں کہ سانحہ 11 ستمبر ایک ڈرامہ تھا جس کے ڈائریکٹرز خود امریکی انتظامیہ کے بعض اعلیٰ عہدے دار ان تھے۔ بہرحال قطع نظر اس کے کہ یہ الزام درست ہے یا غلط' راقم السطور معزز کالم نویس کے دوسرے نکتے کا تجزیہ کرنا ضروری سمجھتا ہے کہ اگر طالبان اسامہ کو امریکہ کے حوالے کر دیتے تو امریکہ افغانستان پر حملہ نہ کرتا۔ میری رائے میں عراق پر امریکی حملے کے بعد اس مؤقف پر اصرار بذات خود ضد اور ہٹ دھرمی کا مظاہرہ ہے۔

ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے ٹاورز ابھی پوری طرح زمین بوس بھی نہیں ہوئے تھے کہ الیکٹرونک میڈیا نے اسامہ بن لادن پر فرد جرم عائد کر دی تھی۔ امریکی صدر بش اور دوسرے اعلیٰ عہدہ داروں نے اسامہ اور طالبان کے خلاف غضب ناک بیانات جاری کرنے شروع کر دیئے تھے۔ امریکہ نے واضح طور پر یہ اعلان کیا کہ وہ کسی قسم کے مذاکرات نہیں کرے گا ہمارا صرف ایک مطالبہ ہے اور وہ فوری طور پر پورا ہونا چاہئے' وہ یہ کہ اسامہ بن لادن کو ہمارے حوالہ کیا جائے۔ ایک آزاد خود مختار ملک کی با اصول اور باغیرت قیادت کا یہ جواب فطری تھا کہ اس شخص کے خلاف کوئی ثبوت فراہم نہیں کئے گئے ہیں۔ اگر کوئی ثبوت ہیں تو ہمیں مہیا کئے جائیں۔ ہم خود مقدمہ قائم کریں گے یا مقدمے کے لئے کسی مسلمان ملک کے حوالے کر دیں گے۔ پاکستانی قیادت طالبان کو صرف ایک بات سمجھاتی رہی' وہ یہ کہ امریکہ بہت بڑی طاقت ہے۔ وہ آپ تباہ و برباد کر دے گی۔ طالبان کا جواب تھا کہ امریکہ بہت بڑی قوت ہو گی' مگر اس میں سچائی نہیں ہے اور محض الزام لگا دینے پر ہم اسامہ کو امریکہ کے حوالے نہیں کر سکتے۔ انہوں نے وسیع تر مشاورت کے لئے ملک بھر سے ایک ہزار علماء کرام کو جمع کیا۔ وہ تین روز تک انفرادی اور اجتماعی مشورے کرتے رہے۔ انہوں نے مشورہ دیا کہ اسامہ سے کہہ دیا جائے کہ وہ خود اپنے تئیں فیصلہ کر کے افغانستان سے نکل جائیں' اور جہاں چاہیں چلے جائیں۔ ملا عمر کی حکومت نے اسامہ سے ایسا نہیں کہا۔

یہ ہے وہ نکتہ جس پر مخالفین طالبان قیامت کھڑی کرتے ہیں کہ خود ملا عمر کی حکومت نے ان لوگوں سے مشورہ چاہا اور پھر خود ہی اس مشورہ کو رد کر دیا۔ لیکن اس دوران میں ہونے والے وہ امریکی طرز عمل کو دانستہ یا نادانستہ طور پر فراموش کرتے ہیں یہ طرز عمل حقیقتاً امریکہ کی بدنیتی کا غماز تھا کہ وہ بہرصورت افغانستان پر حملہ کرے گا' خواہ اسامہ بن لادن کو طشتری میں رکھ کر امریکہ کو پیش کر دیا جائے۔ امریکہ نے علماء کے اس مشورے کے سامنے آنے پر یہ خوف محسوس کیا تھا کہ شاید طالبان اسامہ کو اس کے حوالے کر دیں گے اور اس کا پلان دھرے کا دھرا رہ جائے گا۔ لہٰذا علماء کا مشورہ سامنے آنے پر معمولی سا وقت ضائع کئے بغیر وائٹ ہاؤس کے ترجمان نے حملہ نہ کرنے کے لئے چار مزید شرائط پیش کر دیں جو انتہائی توہین آمیز اور رسوا کن تھیں اور ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ ہمیں یہ یقین دہانی فراہم کرائی جائے کہ افغانستان سے القاعدہ کا نیٹ ورک مکمل طور پر ختم کر دیا گیا ہے اور ہمیں اجازت ہو گی کہ ہم چیکنگ کر سکیں کہ ایسا واقعی ہوا ہے اور ہو رہا ہے۔ افغانستان امریکہ کو تا قیامت یقین دہانی نہیں کرا سکتا تھا کہ اس نے القاعدہ کا نیٹ ورک ختم کر دیا ہے' خواہ وہ اس کے لئے مخلصانہ کوشش بھی کرتا۔ یہ محض الزام نہیں ہے بلکہ عراق وار سے پہلے جو کچھ اس نے کیا' وہ اس کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔ عراق اور افغانستان پر امریکہ نے جس انداز میں جنگ مسلط کی' وہ ظاہر کرتا ہے کہ امریکی اور یہودی مفاد میں پہلے کچھ فیصلے کر لئے جاتے ہیں۔ پھر ان کے لئے مختلف عذر تراشے جاتے ہیں۔ جو عذر بھی بنیاد بن سکے اس کو جواز بنا کر ان اٹل فیصلوں پر عمل درآمد کیا جاتا ہے۔ عراق پر اولاً امریکہ نے یہ الزام لگایا کہ اس کے پاس وسیع پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیار ہیں جس سے نہ صرف علاقے کی سلامتی کو خطرہ ہے بلکہ عالمی امن اور خصوصاً امریکہ کو خطرات لاحق ہیں۔ سلامتی کونسل کے انسپکٹروں نے عراق کا کونا کونا چھان مارا اور یہ واضح رپورٹ دی کہ عراق کے پاس ایسے ہتھیاروں کا سراغ نہیں لگایا جا سکا۔ امریکہ کے الزامات غلط ہیں۔ امریکہ یہ ماننے کو تیار نہ ہوا۔ سلامتی کونسل سے مختلف قراردادیں منظور کروائی گئیں امریکہ کو بڑی امید تھی کہ صدام حسین کسی نہ کسی قرارداد پر لبیک کہنے سے انکار کر دے گا اور اسے جواز مہیا ہو جائے گا لیکن صدام حسین جسے اپنی جان اور اپنا اقتدار ہر شے سے زیادہ عزیز تھا' اس کا ہر مطالبہ مانتا چلا گیا' لہٰذا مجبوراً ایک اور عذر تراشا کہ صدام حسین ظالم ہے۔ وہ عراقی عوام پر بہت ظلم ڈھاتا ہے' لہٰذا ہم پر فرض ہے کہ ہم عراقی عوام کو آزادی دلائیں' خواہ ہمیں اس کے لئے جنگ لڑنی پڑے۔ صدام یقیناً ایک ظالم انسان تھا اور ہزاروں انسانوں کا قاتل بھی ہو گا لیکن امریکہ کو کس نے حق دیا تھا کہ ظالم صدام سے عراقی عوام کو نجات دلانے کے لئے عراق کی اینٹ سے اینٹ بجا دے اور بے گناہ عوام کو سمارٹ بموں کا نشانہ بنائے۔ عراق کے خلاف

⇦

کارروائی کے لئے جب مختلف عذر تراشے گئے تو ان میں سے آخری یہ تھا کہ صدام عراق سے بمع خاندان نکل جائے۔ اس پر صدام کی طرف سے انکار کیا گیا لیکن جب عرب ممالک نے صدام پر دباؤ ڈالا اور آثار یہ پیدا ہوئے کہ شاید وہ یہ شرط بھی مان لے تو امریکہ نے فوری طور پر یہ اضافہ کر دیا کہ صدام جلاوطن ہو جائے اور امریکی افواج جو عراق کی سرحد پر جمع ہو چکی ہیں انہیں پرامن طریقے سے بغداد میں داخل ہونے دیا جائے یعنی عسکری موجودگی کے فیصلے پر ہر قیمت پر عمل درآمد ہوگا۔ بہرحال امریکہ نے سلامتی کونسل کو جوتی کی نوک پر رکھا یہاں تک کہ یورپ تقسیم ہو گیا۔ جرمنی اور فرانس نے عراق پر حملہ کی شدید مخالفت کی لیکن امریکہ ان منصوبوں پر کئی سال پہلے فیصلہ کر چکا تھا۔

مذکورہ بالا دلائل کے جواب میں مخالفین طالبان یہ کہتے ہیں کہ طالبان اسامہ کو امریکہ کے حوالے کر دیتے پھر بھی اگر امریکہ افغانستان پر حملہ کرتا تو کم از کم ننگا تو ہو جاتا۔ عراق وار کے حوالہ سے یہ سب کچھ بھی واضح ہو گیا کہ اخلاقی قدریں امریکہ کے نزدیک کتنی وقعت رکھتی ہیں اور اقوام متحدہ کو اس نے کیونکر اپنے مفادات کے حصول کا ذریعہ بنایا ہوا ہے۔ جب فرانس اور جرمنی اس کے عزائم کے راستے میں حائل ہوئے تو اس نے نئی سلامتی کونسل اور اس کے نئے اصول وضع کرنے کا ڈھنڈورا پیٹنا شروع کر دیا۔ وہ تو یوں کہیے کہ جنگ اور فتح کے بعد جب عراق کمبل بن کر چمٹ گیا اور جان کا روگ بن گیا تو پھر اقوام متحدہ یاد آ گئی۔ لہٰذا امریکہ کے اس طرز عمل کے پس منظر میں اگر طالبان اسامہ کو امریکہ کے حوالے کر دیتے نہ دین کے رہتے نہ دنیا کے۔ آج تو پھر ان کے پاس اخلاقی قوت ہے۔ وہ بااصول اور باغیرت ہونے کا دعویٰ بھی کر سکتے ہیں اور پوری عالمی برادری ان کی اصول پسندی اور غیرت مندی کو بہ نظر تحسین دیکھتی ہے۔

شاید یہی وجہ ہے کہ اُن کی قوت پھر مجتمع ہو رہی ہے وہ چیونٹی بن کر اندھے ہاتھی کو کاٹ رہے ہیں یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے اگر وہ بے اصولی کے مرتکب ہو کر محض اپنی جان اور اقتدار بچانے کے لئے بغیر کسی ثبوت کے اسامہ کو امریکہ کے حوالے کر دیتے تو جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا ہے کہ جنگ تو لازماً اُن پر مسلط ہوتی۔ بمباری سے افغانستان کی تباہی اور بربادی بھی ہوتی اور وہ دوبارہ کبھی سر اٹھانے کے قابل بھی نہ ہو سکتے کیونکہ اخلاقی قوت کی تباہی سے وہ دوبارہ عوام کے دل کبھی نہ جیت سکتے تھے۔ اور وہ انہیں پناہ دینے اور مدد کرنے کو کبھی تیار نہ ہوتے جیسے وہ آج کر رہے ہیں۔ عراق اور افغانستان کی جنگ میں ایک اور اہم فرق ہے وہ یہ کہ افغانستان پر جب جنگ مسلط کی گئی تو **11** ستمبر کا سانحہ بالکل تازہ تھا۔ دنیا خصوصاً مغربی دنیا امریکہ کو مظلوم سمجھ رہی تھی۔ **11** ستمبر کے واقعہ کو امریکہ پر حملہ سے تعبیر کیا گیا تھا لہٰذا امریکہ اسامہ کو وصول کر کے بھی اخلاقی بے ضابطگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے جنگ مسلط کر دیتا تو اُس کی مذمت بہت کم ہوتی اور اسے **11** ستمبر کے سانحہ کا ردعمل قرار دیا جاتا۔ ان تمام حقائق کی روشنی میں یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ بہت پہلے کئے گئے فیصلوں پر عمل کیا گیا اسامہ کا امریکہ کو حوالے کرنے یا نہ کرنے سے جنگ اور تباہی نہیں ٹل سکتی تھی۔

آخر میں یہ گزارش کرنا انتہائی ضروری سمجھتا ہوں کہ دیانتداری کا تقاضا یہ ہے کہ کوئی دستاویز یا وقت اگر کوئی فیصلہ اپنے مؤقف کے خلاف دے دے تو اسے انشراح صدر کے ساتھ قبول کر لینا چاہئے۔ جہاں تک محترم کالم نویس کے اٹھائے گئے پہلے نکتہ کا تعلق ہے کہ مشرف کا یوٹرن لینا اور امریکہ کا اتحادی بننا قبول کر لینا صحیح تھا۔ یہ مقدمہ بھی وقت کی عدالت میں پیش ہو چکا ہے تاریخ اس کا فیصلہ یقیناً سنائے گی اور جانبین کو یہ فیصلہ بھی قبول کرنا ہوگا۔

❀ ❀ ❀

کتاب نما

دنیا بھر میں مسلمانوں کا قتل عام

✱ کشمیر کے مکین عبدالخالق حنیف کو ایک رات بارڈر سیکورٹی فورس کے ایک دستے نے گھر میں گھس کر گرفتار کر لیا۔ اس پر الزام تھا کہ وہ اُگروادیوں (دہشت گردوں) کا مخبر ہے۔ ظالموں نے اس کے ہاتھ پاؤں رسّی سے باندھے اور آنکھوں پر پٹی باندھ کر نامعلوم منزل کی طرف لے گئے۔ تفتیش کے دوران اسے مار مار کر لہولہان کر دیا گیا۔ اسے الٹا لٹکا کر جسم کے ہر حصے کو انگاروں سے داغا گیا' نوکیلے آلے سے گوشت نوچا گیا اور ہاتھ کھولتے پانی میں ڈالے گئے۔

ستمبر **1982**ء میں جس اسرائیلی دستے نے فلسطینی مہاجرین کی خیمہ بستیوں' صابرہ اور شتیلہ پر حملہ کرنا تھا' انہیں پہلے خوب شراب پلائی گئی۔ وقت مقررہ پر نشے میں دھت اسرائیلی فوجیوں نے نہتے اور بے گناہ فلسطینیوں پر حملہ کر دیا۔ انہوں نے ایک ایک خیمے میں گھس کر خواتین کو بے آبرو کیا اور ان کے سامنے مردوں اور بچوں کو گولیوں سے بھون دیا۔ ایک جگہ کئی عورتوں کو جمع کر کے اسرائیلی دستے کے کمانڈر نے کہا "ان سب کو اوپر پہنچا دو۔ یہ فدائی پیدا کرتی ہیں"۔ ظالم اسرائیلیوں نے کھل کر مسلمان عورتوں' بوڑھوں' مردوں اور عورتوں کے خون سے ہولی کھیلی' جو کوئی بھی سامنے آیا' اسے لہو میں نہلا دیا'

برما کی ریاستوں میں "اراکان" وہ ریاست ہے جہاں **70** فیصد سے زائد مسلمان آباد ہیں جب **1942**ء میں انگریزوں نے وہاں قبضہ کیا تو برما کے بدھوں کو مسلمانوں کے خلاف ابھارا جس کے نتیجے میں اتنا زبردست فرقہ وارانہ فساد ہوا کہ اس میں پچاس ہزار برمی مسلمان شہید ہو گئے۔

1948ء میں جب برما آزاد ہوا' تو انگریزوں نے اراکان کا الحاق اس کے ساتھ کر کے وہاں کے مسلمانوں کو بدھوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ یوں برمی حکومتوں کی سرپرستی میں معصوم اور نہتے برمی مسلمانوں پر ظلم و ستم کے نئے دور کا آغاز ہوا۔ ہر حکومت کی کوشش رہی کہ زیادہ سے زیادہ مسلمان مار دیئے جائیں تاکہ اراکان کو مکمل طور پر بدھ علاقہ بنایا جا سکے۔

یہ تھیں مسلمانوں پر مظالم کی چند دلدوز مثالیں' دل و دماغ کو جھنجوڑ دینے والی ایسی سینکڑوں مثالیں "دنیا بھر میں مسلمانوں کا قتل عام" میں ملتی ہیں۔ یہ کتاب ترقی یافتہ اقوام کی انسان دوستی' جمہوریت اور مہذب پن کا پول کھولتی ہے۔ اس کے مرتب' محمد انور بن اختر نے بڑی عرق ریزی سے ایسے عبرت اثر واقعات جمع کئے ہیں جو انسانیت کے دامن پر داغ اور نام نہاد مہذب ممالک کے منہ پر طمانچہ ہیں۔

عالمی اور قومی سطح پر ذرائع ابلاغ کفار یا ان کے چیلوں کے قبضے میں ہیں' لہٰذا مسلمانوں پر دردناک مظالم کی چیختی چلاتی داستانیں عموماً مسلمانوں کی نظروں سے اوجھل رہتی ہیں۔ عام مسلمانوں کو تو ٹی وی پر تھرکتے جسم اور اخباروں رسالوں میں سیاست کے معرکے یا عاشقی کے فسانے ہی دکھائے جاتے ہیں تاکہ اسے تسلی رہے "سب اچھا ہے"۔ حقیقت یہ ہے کہ ساری دنیا کے کفار آج امت مسلمہ کو ختم کرنے کے درپے ہیں اور بڑی منصوبہ بندی سے اسے غلام بنا رہے ہیں۔

فاضل مؤلف نے مسلمانوں کو بیدار کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ آنکھیں کھول دینے والی یہ کتاب مکتبہ ارسلان' اردو بازار' کراچی نے شائع کی ہے۔ قیمت **65** روپے ہے۔ ❀

بھارت تاریخ میں نہیں' تو اپنے گریبان میں جھانکے

عابد فاروق

* اگر ہندوستان کے آج کے دانشور ذرا اپنی ہی تاریخ کو ایک نظر دیکھ لیں تو انہیں پتہ چل جائے گا کہ مسلمانوں نے ہمیشہ رواداری اور دوستی کا طریقہ نبھایا ہے یا دشمنی اور سازش کا۔ لیکن بھلا کیا وکیل اور بحث سے بھی کبھی مسائل کے حل نکلتے ہیں۔ برہمنی ہندو دھرم نے ہمیشہ اور کھلم کھلا مسلمانوں کو ''یادن'' یعنی غیر ملکی' بدیشی' ملیچھ' اور اچھوت سمجھا۔ کیونکہ ہندو سماج کی اپنی بنیادیں ذات پات میں ہیں۔ جبکہ مسلمانوں کا ان رسومات سے کوئی تعلق نہ تھا۔ چنانچہ ہندو اور مسلم عموماً ایک ہی شہر یا قصبے میں الگ الگ محلوں میں ملتے تھے۔ آر۔ سی۔ مجمدار لکھتا ہے کہ ''مسلم قوم کی اکثریت کو الگ تھلگ رکھنا ضروری تھا کیونکہ ہندوؤں کے عادات و اطوار اور سماجی قوانین کی رُو سے مسلمان ناصاف' اپوتر یعنی پلید اور ملیچھ تھے۔ ہندو اُنکے ساتھ شادی بیاہ تو دور کی بات ہے کھانے پینے کا روادار بھی نہ تھا۔ اور مسلمانوں کے چھو جانے سے یا ان کی غذا کی خوشبو تک ہندو کو ناپاک کر دیتی تھی۔''

یہ تو تھے اعلیٰ ترین ہندو برہمن طبقے کے خیالات جسے آر۔ سی۔ مجمدار کوزے میں دریا کی طرح بند کر کے دکھا دیا۔ یہ ہندو سماج کا اجتماعی فیصلہ تھا جو آپ نے پڑھا۔ اور اب ذرا مسلمانوں کا حال بھی سن لیجئے۔ ہندوستان میں مسلم حکومتوں کے دور میں (اسلامی نہیں) مسلم حکومتوں کے دور میں ہمیشہ مذہبی اور سماجی رواداری کی مستقل روایت ملی۔ محمود غزنوی جس کو بت شکن کہا گیا اُس نے اپنے دارالحکومت غزنی میں آباد ہندوؤں کو مورتی پوجا کی اجازت دی ہوئی تھی۔ کشمیر میں سلطان زین العابدین نے ہندوؤں کو ریاست میں آباد کیا اور ان پر سے جزیہ موقوف کر دیا۔ محمد بن تغلق تو ہندو اور جینی جوگیوں سے اپنے پُرتجسس سوالوں کے جواب پوچھا کرتے تھے۔ بلکہ اُن کے مراقبوں وغیرہ پر بحث کیا کرتے تھے۔ بہلول لودھی نے کورکھیت کے تالاب سے مسلمانوں کو پانی لینے کی ممانعت کر دی کیونکہ وہاں سے ہندو پانی لیتے تھے۔ شیر شاہ سوری نے جو شاہراہیں تعمیر کروائیں اُن پر ہندوؤں کے لئے علیحدہ سرائیں اور کنوئیں کھدوائے حالانکہ اس عمل سے خود مسلمانوں کیلئے ہتک کا پہلو نکلتا تھا۔ ان سراؤں میں حکومت کے خرچے پر ہندوؤں کو پانی اور بھوجن مہیا کرنے کے لئے برہمن ملازم رکھے گئے تھے۔ اگرچہ شیر شاہ سوری میاں نواز شریف جتنا امیر نہیں تھا مگر اُس کے بنائے ہوئے ''موٹر وے'' پر مسلمانوں کے لئے نہیں' ہندوؤں کے لئے بھی مفت بھوجن ملتا تھا۔ (مسلمانوں کے لئے بھوجن نہیں بلکہ ''کھابے'' دستیاب تھے)

مذہبی رواداری نے مغلوں کے عہد میں آسمانوں کو چھو لیا۔ مشہور مؤرخ ٹیری لکھتا ہے ''یہاں ہر شخص کو اپنے مذہب کی مکمل آزادی ہے۔'' اور پیٹرو ڈیلا ویلے کے بقول عہد جہانگیری میں ہندو اور مسلمان نہایت اطمینان سے ساتھ ساتھ رہتے تھے۔ اور دونوں کو فوجی اور غیر فوجی ملازمتوں کے مواقع برابر ملتے تھے۔

ہندو مورخ راجندر پرشاد کا ارشاد بھی ملاحظہ کریں ''مسلمان فاتحین کا انداز مجموعی طور پر روادارانہ تھا اور کچھ مسلمانوں کے متعصبانہ رویے کے باوجود جس کا اظہار کبھی کبھی کچھ لوگوں نے کیا۔ اس کے سوا یہ بات پورے یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ ابتدائی دورِ حکومت ہی سے مسلمانوں نے ہندوؤں کے ساتھ برابر منصفانہ سلوک کرنے کی کوشش کی''۔

ہندوؤں کا ایک بہت بڑا اعتراض یہ بھی رہا ہے کہ مسلمانوں نے مندروں کو گرایا اور مساجد کی تعمیر کروائی۔ اس ضمن میں بھی ہندوؤں کے وکیل راجندر پرشاد کی رائے تازہ ہوا کی مانند ہے۔ کہتے ہیں: ''اگر کوئی صاحب علم ہمت کر کے اُن تمام احکامات کی فہرست شائع کر دے جو مسلمان بادشاہوں نے مندروں اور متبرک مقامات کے لئے اوقاف اور وظائف کے سلسلے میں صادر کئے یا بخشے تھے اور اُس کے ساتھ اُن مندروں کی فہرست بھی شامل کر لے جو انہوں نے منہدم یا خراب کئے تو یہ ایک انتہائی مفید اور کار آمد خدمت ہو گی۔''

ہندوؤں نے جب کبھی بغاوت کی یا کوئی ہندو حکومت برسرِ اقتدار آئی تو اُس نے مسجدوں کی بے حرمتی اور ''ان کو منہدم کرنا اپنا فرض سمجھا۔ ماھی پال نے جب لاہور فتح کیا تو اُس نے اس کو تاخت و تاراج کیا۔ تاریخ کے علاوہ صوفی تذکروں میں ملتا ہے کہ مسلمانوں کا قتلِ عام مسجدوں کا گرانا اور ان کی جگہ مندروں کی تعمیر عام واقعات ہیں۔

مسجدوں کے انہدام اور ہندوؤں کے مظالم کی شکایت مجدد الف ثانی نے بھی کی۔ اٹھارہویں صدی میں سکھوں' جاٹوں اور مرہٹوں کا معمول بن گیا تھا کہ جہاں مسلمان ملیں اُنہیں قتل کر دو۔ ہندو تہذیب کے بہت بڑے ترجمان جادو ناتھ سرکار کے مطابق ''بدن سنگھ کی سرکردگی میں جاٹ اور ہندو آگرے میں دندناتے پھرتے تھے۔ اور مکانوں' باغوں اور مسجدوں کو صرف اس غرض سے تہس نہس کیا کرتے تھے کہ شاید کہیں کوئی تانبے کا دستہ' سنگ مرمر کا کوئی ٹکڑا یا چاندی کا پترا ہاتھ آ جائے۔'' اوپر جتنے بھی حوالے آئے ہیں یہ سب ہندوؤں اور غیر مسلموں کے ہیں اور کوئی بھی شخص اِن حوالوں سے اپنی تحقیق کی بنیاد رکھ سکتا ہے۔ اور یہ تمام مورخین مقابلتاً بہت ثقہ اور مستند معتبر ہیں۔

یہاں میں بحث کو سمیٹتے ہوئے دو حوالے مسلمانوں کے نقطہ نظر سے بھی پیش کروں گا:

البیرونی جس نے انتہائی شوق کے ساتھ ہندو تہذیب اور تنگ نظری کو معقول اور مفاہمانہ انداز میں سمجھنے کی کوشش کی اور بہت مایوس ہوا' لکھتا ہے: ''ہندومت کی عصبیت اور تشدد کا پورا رُخ اُن لوگوں کی طرف ہوتا ہے جو اُن کے اپنے نہیں ہوتے' غیر ملکی ہوتے ہیں۔ وہ اُنہیں ناپاک سمجھتے ہیں۔ اُن کے ساتھ رشتے داری تو دور کی بات ہے' کسی قسم کا ربط وضبط مثلاً ساتھ اٹھنا بیٹھنا' خورد ونوش تک مناسب نہیں سمجھتے۔ کیونکہ اس طرح وہ خود اپوتر یعنی ناپاک ہو جاتے ہیں۔ اُنہیں کسی بھی غیر ہندو کے استقبال کی اجازت نہیں۔ گو وہ شخص اس بات کا خواہش مند ہو اور اُس کا رُجحان بھی اُن کے مذہب کی طرف ہو۔

ہندوؤں کے خیال میں کوئی قوم اُن کے ہم مرتبہ نہیں ہے۔ وہ خود پسند' احمقانہ حد تک مغرور' بر خود غلط اور بے حس اور نحس لوگ ہیں۔ اور جو کچھ جانتے ہیں اُسے دوسروں کو بتانا فطرتاً انتہائی برا سمجھتے ہیں۔ اُن کا غرور اور خود بینی اس حد تک بڑھی ہوئی ہے کہ اگر آپ انہیں کسی مسلمان عالم یا سائنس کے بارے میں بتائیں تو وہ آپ کو جھوٹا اور جاہل سمجھیں گے۔

البیرونی کے پانچ سو سال بعد ابوالفضل بھی اسی مشکل سے دوچار ہوتا ہے۔ اُس کا کہنا ہے کہ برہمن اپنے مذہب اور علوم کے اسرار و رموز کبھی نہیں بتاتے۔

ان وجوہات کی بنا پر ہندوؤں کا مذہبی اور معاشرتی انداز نظر تنگ سے تنگ ہوتا گیا۔ اور اس طرح ان کی اجتماعی ترقی اور مسلمان حکومت کے ساتھ وابستگی میں اندر ہی اندر حائل رہا اگرچہ مسلم دور میں انتظامیہ کی قریب قریب ساری ہی نچلی سطح کو ہندو ہی چلاتے رہے۔

وقت کے ساتھ ساتھ ہندوؤں کی علیحدگی پسندی مسلمانوں کے دوش بدوش چلنے کی عادت تو ہو گئی تھی لیکن ہندو دھرم کی رُوح اجتماعی سطح پر مسلمانوں سے برگشتہ ہی رہی۔ اور مسلمانوں کی صلح کل اور وسیع مشربی کا جواب ہمیشہ نفرت اور کراہت سے دیا گیا۔

شہر بہ شہر، قصبہ بہ قصبہ ”تنظیم اسلامی“ کی سرگرمیاں اور اطلاعات

رپورٹ تربیتی پروگرام برائے ملتزم رفقاء بمقام مرکزی دفتر تنظیم اسلامی گڑھی شاہو لاہور

کسی بھی انقلابی جماعت کے ارکان کا اپنے نظریے سے وابستہ ہونا اور پھر اس جماعت کے نظم و ضبط کی پابندی کرنا بہت ضروری ہے۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے کارکنوں کی تربیت ایک مسلمہ امر ہے۔ اس سلسلے میں 14 تا 20 ستمبر ملتزم رفقاء کے لئے مرکزی دفتر تنظیم اسلامی گڑھی شاہو میں ایک تربیتی پروگرام کا انعقاد ہوا۔ مختلف حلقہ جات سے آئے ہوئے 18 ملتزم رفقاء نے اس پروگرام میں شرکت کی۔

پروگرام کا آغاز 14 ستمبر بروز اتوار نماز عصر کی ادائیگی کے بعد ہوا۔ مرکزی ناظم تربیت جناب شاہد اسلم صاحب نے ابتدائی کلمات میں پروگرام کا مقصد اور نظم و ضبط کے حوالے سے گفتگو فرمائی۔ بعد میں رفقاء کا تعارف ہوا۔

نماز مغرب کے بعد جناب رشید ارشد صاحب نے خطاب کیسے کریں؟ کے موضوع پر اہم گفتگو فرمائی۔

روزانہ کے پروگرام اس طریقے سے ترتیب دیئے گئے کہ رفقاء کا اللہ تعالیٰ سے مضبوط تعلق قائم ہو۔ اس سلسلے میں نماز تہجد کا اہتمام اور مسنون دعاؤں کی طرف خصوصی توجہ دلائی گئی۔ یہ پروگرام روزانہ نماز فجر تک چلتا نماز فجر کے بعد درس قرآن کا اہتمام کیا گیا۔ یہ پروگرام ایمان کی آبیاری اور اخلاقی تربیت کے لئے بڑا ممد و معاون ثابت ہوا۔

دوپہر سے قبل کے پروگرام مختلف دروس و خطابات پر مشتمل تھے۔ جن میں ”مطالعۂ دستور“ انفرادی دعوت کا طریقۂ کار (نعیم الدین کا یہ خطاب ویڈیو پر دکھایا گیا) ”دینی فرائض کا جامع تصور“ کارکنوں کے باہمی تعلقات‘ قرارداد تاسیس کا مطالعہ دعوت دین اور اس کا طریقۂ کار (مذاکرے کی شکل میں) جہاد فی سبیل اللہ اور اس کی حقیقت اور منہج انقلاب نبویؐ جیسے اہم موضوعات شامل تھے۔ جہاد فی سبیل اللہ کے سلسلے میں بانی تنظیم اسلامی جناب ڈاکٹر اسرار احمد کا خطاب بذریعہ ویڈیو دکھایا گیا۔ وقفہ آرام کے بعد رفقاء کا تعارف ہوتا اور انہیں تقریر کا موقع دیا جاتا جو تربیت کا ایک حصہ ہے۔ قرارداد تاسیس کا مطالعہ خود امیر تنظیم اسلامی جناب حافظ عاکف سعید صاحب نے کروایا اور رفقاء پر تنظیم اسلامی کا مقصد اور فرد کے لئے تنظیم کی اہمیت و ضرورت کو واضح فرمایا۔ [illegible] صاحب نے خصوصی طور پر فیصل آباد سے آ کر انفاق فی سبیل اللہ پر درس دیا۔

منہج انقلاب نبویؐ پر ڈاکٹر الیاس صاحب نے بہت اچھا اور واضح لیکچر دیا جو خصوصی طور پر کراچی سے تشریف لائے تھے۔

غرض ہر لحاظ سے ملتزم رفقاء کو تربیت اور نظم کا موقع فراہم ہوا۔ آخری دن پھر تمام رفقاء کو خطاب کا موقع دیا گیا۔ امیر محترم نے ماتحت رفقاء کا نظم بالا سے تعلق پر خطاب فرمایا۔ آخر میں مرکزی اسرے کا تعارف ہوا اور تجاویز پیش کی گئیں۔ پروگرام کے آغاز میں جناب شاہد اسلم ناظم دعوت کی والدہ علیل ہو گئیں۔ اس کے باوجود وہ پروگرام میں شامل رہے مگر تیسرے دن ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ بانی تنظیم نے جنازہ پڑھایا اور تمام رفقاء نے بھی شرکت کی۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ آمین

ہفتہ کے دن پروگرام کا اختتام ہوا اور تمام رفقاء اپنے گھروں کو روانہ ہو گئے۔ راقم کی تمام ملتزم رفقاء سے اپیل ہے کہ جنہوں نے ابھی تک یہ تربیت گاہ نہیں کی فوراً آئندہ تربیت گاہ میں شامل ہوں۔ اللہ تعالیٰ اس کی توفیق نصیب فرمائے۔

(مرتب از: ذوالفقار علی‘ حلقہ بہاول نگر)

ہارون آباد میں کالج طلبہ کا درسِ قرآن پروگرام

21 ستمبر بروز اتوار تنظیم اسلامی بہاول نگر کے اُسرہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زیر اہتمام کالج طلبہ کے لئے درس قرآن کا پروگرام منعقد کیا گیا۔

سٹیج سیکرٹری کے فرائض بی۔اے کے طالب علم محمد فاروق افضل نے سرانجام دیئے۔ ساڑھے دس بجے حافظ بشیر احمد صاحب نے قرآن پاک کی تلاوت سے پروگرام کا آغاز کیا۔

اس کے بعد تنظیم اسلامی بہاولنگر کے امیر جناب منیر احمد صاحب نے درس قرآن دیا۔ انہوں نے اپنے خطاب میں اسلام کے پانچ بنیادی ارکان ”توحید‘ نماز‘ روزہ‘ حج‘ زکوۃ“ پر روشنی ڈالی۔ ان کا بیان ڈیڑھ گھنٹہ جاری رہا۔

اس کے بعد جناب ذوالفقار صاحب نے طلبہ میں دینِ حق کا شعور اجاگر کرنے کی کوشش کی۔ آخر میں سٹیج سیکرٹری محمد فاروق افضل نے تنظیم اسلامی کا مختصر تعارف کروایا۔

اس پروگرام جن رفقاء نے بڑی گرم جوشی سے حصہ لیا‘ ان میں مجاہد حسین‘ آصف لطیف‘ فہیم الزماں اور گورنمنٹ رضویہ اسلامیہ ڈگری کالج کی تنظیم انجمن طلبہ اسلام کے ساجد حمید شامل ہیں۔ اس کے علاوہ کالج کے دوسرے طلبہ نے بھی بھرپور شرکت کی۔ ایک بجے دعا کے بعد یہ پروگرام اپنے اختتام کو پہنچا۔

(رپورٹ: محمد فاروق افضل ہاؤسنگ کالونی‘ ہارون آباد)

دعائے مغفرت

تنظیم اسلامی کراچی وسطی کے نقیب کمال الدین صاحب کی والدہ محترمہ قضائے الٰہی سے انتقال کر گئیں‘ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اللہ تعالیٰ مرحومہ کی مغفرت فرمائے۔ برزخ کی زندگی ان پر آسان فرمائے اور آخرت میں انہیں جنت الفردوس میں مقام عطا فرمائے‘ اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

عقدِ نکاح

عاطف تنویر بن تنویر حسین کا عقد نکاح مسنونہ سحر انیس بنت انیس احمد صاحب سے ان شاءاللہ العزیز 17/اکتوبر 2003 بروز جمعۃ المبارک ہوگا۔ خطبہ نکاح مسجد دارالسلام باغ جناح میں بعد از نماز جمعہ انجینئر محمد علی ارشاد فرمائیں گے۔

مقابل حق کے باطل کی بھلا توقیر کیوں دیکھوں

حیا سے آنکھ پانی ہو میں وہ تصویر کیوں دیکھوں
خلاف دین حق جو ہو میں وہ تحریر کیوں دیکھوں

مجاہد ہوں مسلماں ہوں‘ تقاضا بھی ہے غیرت کا
مقابل حق کے باطل کی بھلا توقیر کیوں دیکھوں

مجھے دنیا میں جینا ہے اگر پھر سربلندی سے
کسی کی دسترس میں رہنے کی تحقیر کیوں دیکھوں

بچا لوں دین کی حرمت تو بس یہ کام اعلیٰ ہے
پڑے پاؤں میں گر میرے کوئی زنجیر کیوں دیکھوں

زبان کٹ جائے گی میری قلم پر ہاتھ ہو جائیں
کروں پرچار قرآں کا کوئی تعزیر کیوں دیکھوں

مرا رستہ تو سیدھا ہے چلوں گا تا دمِ آخر
کسی میں اور رستے کا کوئی رہ گیر کیوں دیکھوں

عدو کی ہے یہی مرضی مٹی اسلام کی دنیا
تو پھر میں اپنے ہاتھ سے گری شمشیر کیوں دیکھوں

مجھے حق پر ہی جینا ہے مجھے حق پر ہی مرنا ہے
بچے گی زندگی کیسے میں وہ تدبیر کیوں دیکھوں

کریں وہ کم گر میرے ٹکڑے رہوں توحید پر قائم
ملے گی جب مجھے جنت تو پھر تاخیر کیوں دیکھوں

خیال مصطفےٰ میں ہی جو آنکھیں موند لی میں نے
نظارہ خواب میں سچا تھا اب تعبیر کیوں دیکھوں

میری آمد کا اے اختر یہی مقصد ہے دنیا میں
رہیں خوش مجھ سے سب انساں کوئی دل گیر کیوں دیکھوں

(محمد شفیق اختر‘ دوحہ قطر)

excluded from the Covenant, it follows that Isaac and not Ishmael should have been the child of the sacrifice (when Abraham was commanded by Allah to sacrifice his son). In this regard, the Torah asserts that the son who was to be sacrificed was the **only son** of Abraham. This assertion too does not stand the test of scrutiny because the Qur'an very significantly places the 'good news' to Abraham, of the coming birth of Isaac, immediately **after** the narration of the event of the sacrifice (Qur'an 37:100-112). Thus when the event of the sacrifice took place Ishmael was the **only son** of Abraham. And at no time was Isaac ever the **only son** of Abraham. The fact that the reference to **only son** has survived in the Torah indicates that the original Torah must have named Ishmael as the child of the sacrifice.

Furthermore, if Isaac was the only child of the Covenant, and Ishmael was excluded, it follows therefrom that Isaac, not Ishmael, should have been the son chosen by Allah to assist his father Abraham in the building of the first House of Allah – the first temple (masjid) – and in instituting the annual pilgrimage to that holy temple! Here again, the Qur'an informs us that it was Ishmael and Abraham who built the first House of Allah and Isaac was not present (Qur'an 2:127). From this it follows that Ishmael was most definitely within the Covenant rather than excluded from the Covenant (Qur'an 2:127).

The Qur'an also informs us of the prayer of Abraham while he was constructing the building (i.e., the Ka'aba) in which he prayed that a Prophet should arise from that part of his family (Hagar and Ishmael) which he had settled in Makkah (Qur'an 2:129). The fact that Allah responded to the prayer of Abraham and sent Muhammad as a Prophet from the seed of Ishmael, proves beyond any doubt that Ishmael was not excluded from the Covenant. It is the amended Torah which declared that he was excluded from the Covenant. It is false!

As the final proof that Ishmael was indeed included in the Covenant with Abraham, consider the following: the Torah clearly states that circumcision shall be the sign of the covenant between Allah, Abraham, his offspring and those who follow him (Genesis 17:10-14). It is a fact of history that there have been only two people in the world who have circumcised their males as a religious duty all through history – Banu Israil (today's Jews being the remnant) and Banu Ismail (the Arabs) both of whom are from the seed of Abraham. Prophet Muhammad specifically confirmed the order of circumcision as a fulfillment of the *sunnah* (the way) of Abraham. But he was only required to confirm circumcision to the Arabs. Although they were a pagan idolatrous people he did not have to ask them to do something new. The pagan Arabs were practicing circumcision for thousands of years prior to the birth of Muhammad.

The question therefore arises, why were the pagan idolatrous Arabs practicing circumcision even before it was confirmed by the Prophet Muhammad? After all, no people other than the Jews were doing it. There can only be one answer to that question. The pagan Arabs were doing it because they were the seed of Ishmael and because circumcision, as the 'Sign of the Covenant' had been made obligatory on the seed of Ishmael. The historical fact of circumcision in Arabia thus confirms the existence of an essential link with the religion of Abraham.

Indeed there was such universal conformity amongst the Arabs with the rite of circumcision that the Qur'an did not have cause to devote even a single verse to the subject. And this is a matter of more than passing importance. It is Allah's way of provoking thought for an explanation for the practice of circumcision amongst pagan Arabs. And yet, how few Jews and Christians have been provoked to think of the subject.

In conclusion, whoever did the rewriting of the Torah, and set out to exclude Ishmael from the Covenant, realized that Ishmael had to be demonized before his exclusion could make any sense. And so we find this terrible description of Ishmael in the Torah: "*a wild ass of a man; his hand against every man (i.e., he will be a highwayman). And everyone's hand against him (i.e, all will hate and fight against him).*" Does the Qur'an support his description of Ishmael in the Torah? It does not! Rather it praises the faith, character and spiritual personality of Ishmael (Qur'an 19:54-55). The Qur'an also praises Ishmael for his patience, constancy and determination: and declares that Ishmael was amonst those who, as a result of divine favors conferred uon them, were raised in status above all mankind (Qur'an 6:86). The Qur'an thus very clearly exposes the falsehood about Ishmael in the amended Torah. In doing so the Qur'an restores Ishmael to the status of a worthy son of Abraham fully eligible to the Covenant from Allah, and as such, rejects the Jewish claim as the only chosen people of Allah to the exclusion of Ishmael and his descendents.

As to the Jewish claim that they have the ever lasting possession the holy land is also denied by the Qur'an. The Qur'an maintains that the possession to the holy land depended on adherence to the religion of Abraham and on righteous conduct. Jews violated both of these conditions and Qur'an recorded many instances of such violations, among them: changing the Word of God, taking gods besides Allah, violating prohibition against riba (usury), slandering Maryam, rejecting Jesus as the Messiah, killing the Prophets of Allah, and leading people astray.

Some of these acts were forgiven by Allah, but others placed them in the position of a people with whom Allah is so very angry that He has placed a curse on them!

What the above material clearly confirms is that the Jewish people no longer enjoy the status of being a people included in the Covenant Allah made with Abraham, and this is because of a curse Allah has placed upon them until the Last Day in consequence of their numerous acts of shirk and kufr and Zulm.

The implications for Muslims of the recognition of the Jewish State of Israel are enormous and dangerous. It would be an act of kufr (disbelief) since it would require them to a repudiate the Qur'an. Muslims would be following in the footsteps of Jews if, despite all that is in the Qur'an, they still decide to extend recognition to the Jewish State of Israel. They would be throwing the Qur'an behind their backs in the manner in which the Jews responded to the advent of Prophet Muhammad.

It would be a betrayal of Allah and Prophet Muhammad since Allah sent the Prophet and created the Community of Muslims (ummah) to pursue a basic mission of restoring and preserving the religion of Abraham. This was achieved by the Prophet in his lifetime. The recognition by Muslims of the Jewish State of Israel would imply an abandonment of the religion of Abraham! The danger which we face today is that of so-called Muslim scholars and so-called leaders of the Muslim community who are either themselves profoundly misguided in respect of this subject or, worse, are engaged in an act of betrayal of Allah, His Messenger, the religion if Islam and the ummah of the Prophet. Such co-called Muslim scholars support the recognition of the Jewish State of Israel and are actively and deliberately engaged in leading their largely unsuspecting followers astray.

Excerpt taken from *The Religion of Abraham & The State of Israel* by Imran N. Hosein

Nida-e-Khilafat Lahore

THE DILEMMA OF RECOGNIZING ISRAEL

Imran N. Hosein

To 'recognize' the Jewish State of Israel, or not to 'recognize', that is the dilemma which confronts so many governments in today's world of Islam. It is a dilemma for them because there is only one force in the world today which stands in the way of Jewish Israel achieving universal acceptance and recognition from the gentile international community, and the security and guarantee of survival which, it assumes, is assured by that recognition, and that is Islam.

The impoverished Muslim masses resolutely oppose the 'recognition' of the State of Israel, and they are a force to be reckoned with since Islam is rapidly re-emerging as a most significant actor in international affairs. The predatory elite in the Muslim world, on the other hand, are shifting their position and moving in the direction of an accommodation with Israel which would protect their vested interests. This is described as the 'peace process'. The predatory Muslim elite, accustomed to power and privilege, is terrified at the prospect of resurgent revolutionary Islam winning power in Egypt, Pakistan etc., and then dealing with them in the manner in which revolutionary Islamic Iran dealt with them. And so the pressure to recognize Israel comes from a terrified Muslim elite living in mortal fear of the impoverished Muslim masses and of Islam's stern and uncompromising justice.

The pressure to recognize Israel also comes from USA and its allies and clients, and from the international Monetary Fund etc. Growing Jewish influence over (Middle East) foreign policy in these governments, and over decision-making in these international organizations, and the perception of a long-term Islamic threat to Israel, to western capitalism and democracy and to the secular model of society which was designed to sustain them, lie at the very heart of that pressure which Muslim governments now face.

The capacity of Muslim governments to resist such pressures becomes weaker and weaker as political and strategic vulnerability and the economic strangle-hold of *riba* (usury) increase! Indeed the supreme game in the games of dominance which constitute the New World Order is political and strategic blackmail and economic and financial imperialism. No where is this supreme game played more resolutely than in the effort to preserve and promote the security of the Jewish State of Israel.

The act of 'recognition' of the Jewish State of Israel implies, *ipso facto*, acceptance of Israel's legitimacy. One cannot 'recognize' a State and yet maintain that it is illegitimate! But acceptance of the legitimacy of the State of Israel is fundamentally different from the acceptance of the legitimacy of any other State in the world because of the following:

i) recognition of the State of Israel implies acceptance of the basic claim of the Jews that *Allah* gave the holy land (of Palestine) to them as and exclusive and ever-lasting possession! Even to this day the land still belongs to them since *Allah* gave it to them.

ii) the land of Palestine is recognized in the Torah and Qur'an as the holy land. The Jews believe that they are the chosen people of Allah, that Allah made a covenant with them, and that the covenant is still valid. They believe that they have the right to take possession of the holy land because of their special status with Allah. They believe that their success in taking control of the holy land validates their beliefs about themselves, their religion, and their claim to Truth. Recognition of the State of Israel implies acceptance of Judaism's right to control the holy land and, thus, validates Judaism's to Truth!

When the Qur'an is used to examine these claims they are found to be falsehoods uttered against Allah and hence to be shirk! Most Muslims have faithfully abstained from that act of *shirk*.

This book attempts to use the divine revelation which came after the Torah and the Gospel, i.e, the Qur'an, as the criterion (al-Furqan) with which to determine whether Allah did the following, as claimed in the Torah:

1) Exclude Ishmael from His Covenant,
2) Give the holy land of Canaan (modern-day Palestine) to the Jews as and exclusive and everlasting possession,
3) Give to the Jews unconditional title to the holy land.

The conclusions to which we arrive will determine the implications for Muslims of recognition of the Jewish State of Israel.

The Qur'an thus supports the claim of the Torah that the land of Canaan, described as the holy land, was given to the Israelites (*Banu Israel*).

The position of the Qur'an, however, is that Allah did not give to any people exclusive and unconditional title to the holy land. The holy land belonged to Banu Israil so long as they were true to the religion of Abraham. Righteous conduct is the very foundation of the way of life which was ordained by the one God. The Jewish conduct with Moses was wicked. They violated the very substance of the religion of Abraham. And so they were punished. The punishment was that they were denied entry into that holy land for forty years (Qur'an 5:29).

From today's Jewish perspective, Allah had excluded Ishmael from the Covenant. This claim implied that Jews were the (exclusive) chosen people of Allah. They understood that to mean that divine revelation was their exclusive preserve. As a consequence they believed that Prophethood, also, was their exclusive preserve since divine revelation and Prophethood were located at the very substance of the Covenant! If this Jewish claim is true then it follows that Ishmael could not, therefore, be a Prophet. The Qur'an, however, affirms that Ishmael was a Prophet of Allah, hence, it follows that he was included in the Covenant. Therefore the statement in the Torah concerning the exclusion of Ishmael from the Covenant did not have come from Allah.

Also, if Isaac was the only child of the Covenant and Ishmael was excluded, as the Jews claim, it would follow therefrom that no Prophet could arise from the seed of Ishmael – Prophethood being the very essence of the Covenant. It would also follow that none but an Israelite/Hebrew (today known as Jews) could receive divine revelation. In the Qur'an, however, Allah affirms that Muhammad was a Prophet and Messenger of Allah. He also affirms that the Qur'an was revealed to him (Muhammad) in order that he might admonish a people whose forefathers had received no admonition.

Moreover, if Isaac was the only child of the Covenant and Ishmael was specifically